گوشہ اَرمان



سخاوت حسین

ناول

سخاوت حسین

گوشہ آرمان

اے رب کریم! اے رب رحیم میری ہر شب زیاں جاتی ہے۔ اسے سوچ کر رگ جاں پھڑک اٹھتی ہے۔ شوق روگ کی انگلی تھامے متحرر راستوں پر چلتا ہے۔ آسمان پر اڑتے پرندے ہر لمحہ اسے سوچتے ہیں۔ وہ میرے حلق کی پہلی آواز تھی۔ اتنے سال محبت کے اونچے راستوں پر چل کر نیچے موجود دیگر رشتوں کو اس کی خاطر میں نے بے حسی کے زہر سے مار دیا مگر اے رب کائنات پھر تو نے میری ذات کو بے ذات کر دیا۔ مجھے مات ہو گئی۔

اے خدا! وہ جو جاں سے قریب ہیں وہ آج بے جان سے ہوئے پھرتے ہیں۔ لمحے ساکت ہیں۔ عقل حیران ہے۔ ذوق پریشان ہے۔ انہیں کہاں ڈھونڈوں۔ اب کن کہہ دے۔ ایک دفعہ کن کہہ دے۔ میں سنور جاؤں۔ بکھرا وجود نکھر جائے۔ دل کی تڑپ سکوں پائے۔

کبھی کبھی زندگی اداسی کی وہ دبیز چادر بن جاتی ہے کہ انسان اسے اوڑھے اپنے وجود کے اندر تک پہنچ جاتا ہے تبھی خاموشی اور تنہائی اس چادر کو یکجا کیے ہوئے دھاگوں کا سا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہر الجھا ہوا دھاگہ انسان کو سلجھی ہوئی ذات کے قریب لے جاتا ہے۔ پھر وہ ذات کے صندوق میں بند انسان سے مل لیتا ہے جسے شاید عام حالت میں وہ کبھی مل ہی نہیں پاتا۔ آج اداسی میرے پورے وجود میں ریت کے ذروں کی طرح بس گئی

ہے۔ میں ٹوٹ رہا ہوں۔ بکھر رہا ہوں۔ سنا تھا کہ جب ٹوٹے ہوئے دل تیرے پاس آتے ہیں تو تو محبت کے الہام دل پر اتار دیتا ہے۔ تب سکون کی بارش وجود کے اندر موجود ہر میل کو صاف کر دیتی ہے۔ مجھے سنوار دے میرے مولا، میرے کرب سے اٹے لمحوں کو نکھار دے۔ اے قادر مطلق تیرے بس میں سارے بس ہیں۔ تیرے سامنے بس بھی بے بس ہے۔ اے صبح کو امید کا دیا جلانے والے، شب کی سیاہی کو سکون کی چادر عطا کرنے والے۔۔۔ میرے زندگی میں بھی وہی سکون لوٹا دے۔ مجھے بھی ضمیر کی عدالت میں سرخروئی عطا کر۔

جائے نماز پر میں تسبیح ہاتھ میں لیے ہر لمحے زندگی کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ اے مضطر دلوں کو سکون دینے والے سکون کا اوس میرے وجود پر بھی گرا دے۔ مجھے سنوار دے مولا۔ مجھے نکھار دے مولا۔ سجدے میں جانے آنسوؤں کی بارش میں نہانے وہ رحیم خدا سے اس کی رحمت طلب کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

صبح سویرے بارش کی ننھی بوندوں نے ہر شے کو نکھار دیا تھا۔ یونیورسٹی کا لان ٹھنڈی ہواؤں کے ساز سے عشق کا سا خمار پیدا کر رہا تھا۔ درختوں کی شاخیں اتنے ترنم سے جھول رہی تھیں کہ جیسے محبت کی شراب پی لی ہو۔ ہر منظر بارش کا جام پی کر بہک رہا تھا۔ یونیورسٹی سے متصل ہاسٹل کے روم نمبر 12 کا داخلی دروازہ کھلا تھا۔ ہاسٹل کا کمرہ انتہائی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ پورا کمرہ پھولدار کارپٹ سے لدکر کمرے کے حسن میں چار چاند لگا رہا تھا۔ داخلی دروازے کے دہنی طرف باہر کو کھلتی ایک کھڑکی سے ٹھنڈی ہوائیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں جبکہ بائیں جانب لگے شیشے میں ارسلان کب سے اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی دیر سے کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب کہ افتخار جو اس کا دوست اور کمرے کا ساتھی تھا، شدید بوریت سے اسے تیار ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

جب رہا نہ گیا تو تنگ آ کر اسے ڈانٹتے ہوئے کہنے لگا۔

" ارسلان کیا کر رہے ہو یار؟ پورا ایک گھنٹا ہو گیا تمھیں شیشے کے پاس خود کو سنوارتے ہوئے، توبہ اتنا وقت تو لڑکیاں بھی نہیں لیتی ہوں گی جتنا تم تیار ہونے میں لیتے ہو۔ "

جب کہ ارسلان اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

" کچھ نہیں دوست شادی پر جانا ہے۔ گویا اک آگ کے دریا کو پار کرنا ہے۔۔۔ بس اسی کی تیاری کر رہا

ہوں۔تم بھی کچھ سیکھو سڑیل انسان!"

"سڑیل اور میں۔۔۔۔" افتخار نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

"اور کیا؟ یاد ہے پچھلی دفعہ تم کرتا پاجامہ کے ساتھ جوگر پہن کر شادی میں چلے گئے تھے۔ مجھے کتنی سبکی اٹھانی پڑی تھی۔"

"ھاھاھا، یار! مجھے فیشن کا بالکل شوق نہیں۔ اس دن میرے دونوں جوتے ہاسٹل کا دوسرا لڑکا لے گیا تھا لہذا پہننے کے لیے جوگر ہی بچے تھے۔" افتخار نے اپنا دفاع کیا۔

"فیشن۔۔۔ارسلان کا قہقہہ بلند ہوا۔فیشن مت کہو میری جان! فیشن تو بہت دور کی چیز ہے۔تم انسانوں کی طرح کپڑے پہننا سیکھ لو۔فیشن آگے کی منزل ہے۔"

"ویسے تمھیں تیاری کی کیا ضرورت ہے۔سمارٹ ہو، ہینڈسم ہو،لڑکیاں مرتی ہیں تم پر،اوپر سے اتنے باتونی اُفف، کسی کو بھی باتوں سے دام میں کر لیتے ہو۔سچ بتاؤ کیسے کر لیتے ہو۔"

افتخار کو موضوع بدلنے میں ہی عافیت محسوس ہوئی۔

اچھا۔ارسلان نے زور سے قہقہہ لگایا۔ارسلان اس کا طنز واضح طور سمجھ گیا تھا۔

"میرے بارے میں جتنا تمھیں پتہ ہے اتنا تو مجھے بھی اپنی ذات کا علم نہیں ہے۔ چلو ہٹو اب جانے دو۔ باہر کی ہوا آنے دو۔"

"جاؤ جاؤ۔کتنی حسینائیں منتظر ہوں گی ارسلان میاں کی۔۔۔ویسے شادی پر جا رہے ہو تو میری نصیحت اپنے کانوں سے اسی طرح باندھ لو جیسے عورتیں پلو سے پیسے باندھتی ہیں کہ اس شادی پر کھانا تھوڑا کم کھا لینا۔پچھلی دفعہ تمھاری پلیٹ میں مجھے گوشت کے سوا جو چیز نظر آئی تھی دس دانے چاول کے تھے اور ایک منہ چڑاتا کانٹا اور چمچ۔۔۔جو شاید تنکا تنکا چاول کو اکھٹا کرنے کے لیے پلیٹ میں رکھے گئے تھے۔"

افتخار بھی کب موقع چھوڑنے والا تھا۔

ھاھاھا! اس دن ہم پورے دن کے بھوکے تھے، یاد نہیں تمھیں، شادی کے جھنجھٹ میں "میس" کا کھانا بھی چھوٹ گیا تھا۔چوبیس گھنٹوں بعد کچھ کھانے کو مل رہا تھا تو یہ تو حق بنتا تھا نا۔"

"حق! تم تو کانگو سے رہا ہو کر آئے تھے نا۔ کتنے دن قید میں رہے تھے جو شادی کے کھانے کو امید اور زندگی کی آخری کرن سمجھ بیٹھے تھے مسٹر ارسلان۔" افتخار کہاں چپ رہنے والا تھا۔

"افتخار یہ عقل والوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ تم کہاں سمجھو گے۔ ویسے بھی عقل کا نام لیتا ہوں تو تمھارا چہرہ بگڑ جاتا ہے۔ درد سمجھ سکتا ہوں۔"

ارسلان کی بات سن کر وہ مسکرا دیا۔

"ہاں جی بالکل! کھانے کی باتیں ہی عقل والوں کے لیے رہ گئی ہیں۔ باقی تو دنیا چاند پر پہنچ گئی ہے ایک تم ہو جو ایک شادی سے دوسری شادی پر پہنچ جاتے ہو۔ مگر جتنے لوگوں کی شادی میں تم گئے ہو مجال ہے ایک بھی تمھاری شادی میں پہنچ سکے کیوں کہ بقول تمھارے تم تو بڑھاپے کے دلہا ہو۔"

افتخار نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا تو ارسلان بے ساختہ مسکرا دیا۔

صحیح فرما رہے ہیں محترم آپ، جہاں تک رہی بات شادی کی تو وہ دن ویسے بھی یادگار دن تھا۔ جس ٹیبل پر میں بیٹھا تھا وہیں دولہا کے ابا میاں بھی موجود تھے۔ لہذا سب سے پہلے تو کافی دیر مووی بنانے والی ہستی کو مصنوعی مسکراہٹ سے نوازنا پڑا۔ پھر کافی دیر جاننے والوں سے فضول باتیں، ایسی باتیں جن کا نہ سر ہے نہ پیر وہ ساری باتیں شادی کی ٹیبل پر کی جاتی ہیں۔ جو دس سال سے ایک دوسرے سے نہیں ملتے شادی کے انھی دنوں دس سال کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ میں نے تو غصے میں کھانا کھایا تھا۔ اس دن جتنا لوگوں نے مجھے پکایا تھا اتنا تو سالن بھی نہیں پکا تھا۔ ارسلان نے منہ بناتے ہوئے کہا تو افتخار کی ہنسی چھوٹ گئی جب کہ ارسلان جانے کے لیے بالکل تیار ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

زرینہ یونیورسٹی کی پراعتماد لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ ارسلان، افتخار اور زرینہ اچھے دوست تھے۔ تینوں ایک ہی گروپ میں بیٹھا کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں یہ ان کا پانچواں سمسٹر تھا۔ دلکش شخصیت کی مالکن۔۔۔ ہلکے میک اپ اور مہنگے ترین ملبوسات کے ساتھ وہ کسی خوب صورت حسینہ سے کم نہ لگتی تھی۔ زرینہ صرف ڈیزائنر سوٹ پہنتی تھی۔ اس کے والد شہر کے مشہور کاروباری شخصیتوں میں سے ایک تھے لہذا پیسے کی ریل پیل تھی۔

ارسلان یونیورسٹی کے پر اعتماد لڑکوں میں سے ایک تھا۔ وجیہ، اچھے قد کاٹھ کا مالک، جب بھی بات کرتا دلیل سے کرتا اور دلوں میں گھر کرنا اسے خوب آتا تھا۔ جہاں بھی جاتا اس کے اچھے دوست بن جاتے۔ ایسے دوست جو صرف وقتی نہیں بلکہ اس کے ساتھ چلنے والے ہوتے۔ وہ دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ حد سے زیادہ خود پر یقین اور اعتماد زندگی کے ہر میدان میں اسے کامیابی سے نوازتا تھا۔

وہ دونوں یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈسپوزیبل چائے کا کپ اور چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں۔۔۔ آج پھر ارسلان بحث کے موڈ میں تھا۔ وہ اکثر کسی موضوع کو زیر بحث لا کر گھنٹوں بلاوجہ مغزماری کرتے رہتے تھے۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے۔

"سنو زرینہ!" آخر کار ارسلان نے بحث کا آغاز کر ہی دیا۔

" کہو" چائے کا سپ لیتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"زرینہ جب میں شادی کروں گا تو ایسی لڑکی سے، جو بہت خوبصورت ہو، اس کی آنکھیں عمر خیام کی نہ سمجھ میں آنے والی رباعیوں جیسی پیچیدہ ہو۔ اس کے گال کشمیر کے سیب سے زیادہ خوبصورت ہوں اور جب وہ ہنسے تو کائنات اس کی ہنسی سے دم بخود ہو جائے۔ جب بولے تو جھرنوں میں اس کے لفظوں سے ارتعاش پیدا ہو جائے۔ جب چپ رہے تو کائنات اس کی خاموشی پر واری جائے۔ حد سے زیادہ خیال رکھنے والی، میرے لئے سنورنے والی، جو صرف روز گھر کی چوکھٹ پر میرے قدموں کی آہٹ کی منتظر ہو۔ جو میرے ہجر کی صلیب پر روز چڑھے۔ ایسی لڑکی جو صرف میرے لئے ہی بنی ہو۔" وہ مسلسل بول رہا تھا تبھی زرینہ نے اسے ٹوک دیا۔

"اور پھر تمھاری آنکھیں کھل جاتی ہیں بلکہ آنکھ کیا ایک بڑا سا شعور کا پتھر تمھارے سر سے ٹکراتا ہے اور تم پھر سے لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جاتے ہو میرے مجنوں۔۔۔"

زرینہ نے اس کے لفظوں کا مذاق اڑاتے ہوئے قہقہہ لگایا تو وہ چڑ گیا۔

"تم ہمیشہ ہی مذاق اڑاتی ہو۔ ایسا بھی نہیں ہے۔ کوئی تو ہو گی یار۔ کوئی تو بنی ہو گی میرے لئے۔ محبت کی کہانی میں میرا کردار بھی کسی شہزادے سے کم تھوڑی ہو گا۔ ایسا ہیرو جو صرف اپنی ہیروئن کا ہوتا ہے۔" اس کی بات سن کر وہ زیر لب مسکرا دی۔

"ارسلان تمھیں ایسی لڑکی ملے گی کہاں؟ ہر لڑکی ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہر لڑکی عمر خیام کی رباعی جیسی خوب صورت ہی ہوتی ہے لیکن تم جیسے لڑکے اسے کارل مارکس کا فلسفہ بنا دیتے ہو۔ ہر لڑکی پاپولر کہانی جیسی سمجھ میں آنے والی ہوتی ہے مگر جانے کیوں تم اسے کانٹ کا مشکل ترین فلسفہ سمجھنے لگتے ہو۔ جب تم عورت کو بے شمار توقعات کی دنیا سجا کر گھر لانا چاہتے ہو تب وہ گھر میں آجاتی ہے مگر تمھارے دل میں نہیں آپاتی۔ عورت کو عورت سمجھ کر توقعات وابستہ کرو گے تو نتیجہ بھی ویسا ہی ملے گا۔ خیر آج تک تو تمھیں کوئی بھی پسند نہیں آئی تو اب کون سی لڑکی پسند آئے گی؟" زرمینہ نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ چائے آدھی ہو چکی تھی مگر بحث پورے زور سے جاری تھا۔

"ہاں تم خود دیکھو نا شادی کے لیے تو کوئی تو ایسی ہو جس کی زلفوں کے سائے میں زندگی بسر ہو۔ جس کے ہونٹوں سے گرتے لفظوں میں جب چاندی کی ملاوٹ ہو تو ساز دل پر بہت سے سر بکھر جائیں۔ ایسی لڑکی جو دل سے اتر ہی نہ سکے۔ زندگی میں نے گزارنی ہے تو میرے اصولوں سے گزرے گی۔" ارسلان ڈسپوزیبل کپ فضا میں لہراتے ہوئے وجد کے عالم میں بولا۔

"ارسلان! دعا ہے تمھیں ایسی لڑکی مل جائے۔ ویسے کیا کہتے ہیں پر جو بھی کہتے ہیں اچھا ہی کہتے ہیں کہ کائنات کو ایک نکتے پر بھی جمع کریں تو اس میں مرد کی ایک خواہش سب پر بھاری ہوگی۔ اسے روز ہی ایک نئی لڑکی کا پیار چاہئے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو اسے ملے وہ قلوپطرہ ہو اور جسے وہ ملے وہ بس چپ چاپ صابر شاکر سی لڑکی ہو جو بس اسی کی سنے۔ اسی کی مانے اور مرد گریبان چوڑا کر کے کہے یہ دیکھو میری محبت کو۔۔۔ ایسا ہوتا ہے محبوب۔۔۔

تم مرد دھڑلے سے کہہ دیتے ہو کہ محبت وہ ہے جس میں ماننے سے زیادہ منوائی جاتی ہے اور منوانا تم نے ہمیشہ عورت سے ہی ہوتا ہے مگر یہ کبھی نہیں کہتے کہ محبت دو طرفہ ہوتی ہے جہاں دونوں کو ماننا پڑتا ہے۔ دونوں کو وہی مان ایک دوسرے کو دینا پڑتا ہے۔ وہی جذبات دونوں طرف شدت کے ساتھ پائے جاتے ہیں لہذا دونوں اطراف ہی اسی شدت کی ضرورت ہے جو تم صرف ایک سائیڈ پر دیکھتے ہو۔"

لاحاصل بحث یوں ہی جاری رہتی اگر افتخار درمیاں میں نہ ٹپک پڑتا۔ وہ ارسلان کی فطرت سے بخوبی آگاہ

تھا کہ وہ کسی طور ہار ماننے کو تیار نہیں ہوگا جب کہ زرینہ بھی ہار کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیتی تھی۔ افتخار نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔

" آپ دونوں صحیح ہیں مگر وقت غلط ہے۔ چائے کے نشے میں، زندگی کے فلسفے کو یونیورسٹی کے لان میں بیان کرنے سے بہتر ہے کہ دونوں مجھے کینٹین سے اچھی سی بریانی کھلادیں۔ جو کھلائے اس کا بھی بھلا۔ جو نہ کھلائے اس کا یہ بڑے سر والا بھلا۔ اس نے منہ بناتے ہوئے ارسلان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایسے جملے کہے تو دونوں بے ساختہ مسکرا دیے۔ آخر افتخار نے بحث سمیٹ دی تھی۔

☆......☆......☆

افتخار ارسلان کے بہترین دوستوں میں سے ایک تھا۔ افتخار سب سے پہلی قطار میں بیٹھتا تھا اور ارسلان کو بھی آگے بیٹھنا ہمیشہ سے پسند تھا اگرچہ وہ پڑھائی میں گزارے لائق تھا مگر اپنے اعتماد اور سوالات کی وجہ سے کلاس میں جلد اپنا مقام بنالیتا تھا۔ جب تمام طالب علم پروفیسر صاحب سے اپنا تعارف کروا رہے تھے تب ارسلان کو افتخار کا تعارف کافی اچھا لگا تھا۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا مگر والدین نے اچھے سے سکول اور کالج میں داخلہ دلوا کر بیٹے کو تعلیمی لحاظ سے اونچی مسند پر فائز کرنے کے لیے اپنی تمام زندگی تک تیاگ دی تھی۔ کلاس میں سب سے طویل اسی کا تعارف تھا اور تالیاں بھی اسی کے لیے ہی بجائی گئیں تھیں۔ کلاس سے باہر نکلتے جب ارسلان نے افتخار کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے خوشی سے قبول کرلیا تھا۔ ارسلان زبردستی اسے کینٹین لے آیا تھا مگر جب پیسے دینے کی باری آئی تو اسے تمام جیبوں کی تلاشی لینے کے بعد بھی اپنا بٹوہ نہیں ملا تھا تبھی افتخار نے مسکراتے ہوئے کینٹین والے کو پیسے ادا کروئے تھے اور دونوں مصنوعی لڑائی میں اب بھی اس واقعے کا ذکر کرتے تھے۔ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے اسے مکمل سکالرشپ ملا تھا۔ دونوں کی قسمت اچھی تھی لہذا دونوں کو کمرہ بھی ایک ہی ملا تھا جس میں زیادہ کردار بہرحال ارسلان کا ہی تھا کہ جس نے ایک ہی کمرہ حاصل کرنے کے لیے کافی جتن کیئے تھے۔

ارسلان جیسے کمرے میں داخل ہوا افتخار کو پہلے سے موجود پایا۔

" آؤ ارسلان میاں! آج تو کہیں نہیں جانا۔ سوچ لو کسی پھپھو، تائی، چچی۔ کسی کی شادی، میت یا پھر

سالگرہ۔۔۔"

افتخار نے تھکے ہارے ارسلان کو آتے ہی تپا دیا تو کہاں چپ رہ سکتا تھا۔

" کیوں نا آج میں تمھیں مار کر تمھارے جنازے کی بریانی کھاؤں۔" ارسلان کافی غصے میں لگ رہا تھا۔

" ھاھاھا، میرے جنازے پر بریانی نہیں دال ماش پکانے کا حکم دوں گا۔ وہ بھی مکمل مصالحے والی تاکہ تمھیں کھانا ہضم نہ ہو۔"

افتخار آج اسے تپانے کے موڈ میں لگ رہا تھا۔

" اچھا کوئی بات نہیں دال ماش ہی سہی۔۔ ویسے میں انکل سے خصوصی کہوں گا کہ دال ماش میں تھوڑا چکن ڈال لیں یا کیوب ہی شامل کر دیں تاکہ کھانے کا مزہ تو آئے۔ کہاں تم روز روز مرو گے۔ یہ سعادت ایک بار ہی نصیب ہوگی اور کیا نصیب ہوگی۔ تمھاری قبر پر جلی حروف سے لکھواؤں گا افتخار دال ماش والا۔۔۔"

ارسلان نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

" میری موت تو بعد میں دیکھنا۔ ابھی جس سالن کا ذکر خیر کرنے لگا ہوں اس کا سن کر تمھارے ہوش اڑ جائیں گے۔ ہاتھوں کے طوطے ہواؤں میں فریاد کرتے پھریں گے۔ پتہ ہے ارسلان آج۔۔۔ آج پھر سے تمھارا سب سے پسندیدہ سالن بنا ہے۔" افتخار نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

" کونسا؟" ارسلان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

" آلو پالک۔۔۔ سنو آلو پالک۔ بچے یہ تمھاری لک ہے کہ تمھیں آلو پالک مل گئے۔"

افتخار نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو ارسلان زچ ہو گیا۔ اسے اگر کوئی سبزی اچھی نہیں لگتی تھی تو وہ آلو پالک ہی تھا۔

" یار چلو باہر چلتے ہیں۔ ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہر سالن میں آلو کو ایسے شامل کیا جاتا ہے جیسے وہ اس سالن کا خصوصی لوگو ہو۔ جیسے کوئی ساس ہو جس نے ہر معاملے میں شامل ہونا ہے۔ محلے کی وہ آنٹی ہو جس نے ہر معاملے میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑانی ہو۔"

ارسلان نے کچھ اس انداز سے کہا کہ افتخار کو ہنسی آ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ ارسلان کو آلو پالک نہیں پسند اسی لیے

جب بھی یہ سبزی بنتی وہ اسے لازمی چڑاتا۔ دونوں اچھی خاصی بحث کرتے اور آخر کار بائیک پر کسی قریبی ہوٹل سے کھانا کھا آتے۔

☆......☆......☆

زندگی مبہم تر لفظ، زندگی اوہام کا مرکز، زندگی وجود کے منہدم ہونے کی کہانی، زندگی یقین کی حلاوتوں سے آہستہ آہستہ دل کے چمن کو اجاڑ دینا، زندگی بے نام سی آہٹ۔۔۔۔۔

زندگی لفظ کشید کرتی ہے۔ زندگی نفس کو رگیدتی ہے۔ زندگی عقل کو خریدتی ہے۔

میں بھٹکا ہوا، ہر سو بھٹک رہا ہوں۔ میں بہکا ہوا پھر سے بہک رہا ہوں۔ میں اٹکا ہوا پھر سے جذبوں کے درمیاں اٹک رہا ہوں۔ میں سراپا سوال ہوں۔

یہ موسم، یہ قہقہے لگاتے انسان، ان کی بازگشت کرتی آوازیں، ان کی مہکتی یادیں، ان سے اٹھتی خوشبوئیں، ہر سو ان کی آتی صدائیں، شاید یہی زندگی ہے۔ کھو کر راہ کو ڈھونڈنا اور پھر راہ کو پھر سے کھونا، خود کو کھونا، اپنی ہی تلاش۔۔۔

میرے سامنے درد کا آسمان ہے۔ میرے سامنے لفظوں کا امتحان ہے۔ میرے سامنے اجنبیت کا کھلا میدان ہے۔ میرے سامنے عقل محو حیران ہے۔ نیلے آسمان کو سنوارتے چند سفید بادل اور ان کے آس پاس منڈلاتے پرندے شاید زندگی بھی ایسی ہی ہے جہاں رشتوں کے آسمان پر جذبات کے سفید بادلوں کے گرد وفا کے چند پرندے منڈلاتے رہتے ہیں۔ زندگی درد کا وہ چاند ہے جہاں غم کا چکور ہمیشہ سے اسی چاند کے گرد محو طواف رہتا ہے جیسے پروانہ روشنی کے مدار میں گھوم کر جل جاتا ہے انسان بھی درد کے ہجوم میں تنہا ہو جاتا ہے۔ جفت سے طاق ہو جاتا ہے۔

اور غم سارے امتحانوں کا نصاب ہے۔ حیات پر اداسی طاری کرنے والا راگ ہے۔ حوصلوں کو درد کے زہر سے مار دینے والا ناگ ہے۔

زندگی لحہ بھر میں اٹھتی ہے۔ لمحے بھر میں اٹھا دیتی ہے۔ زندگی کی گرد میں اٹے پاؤں جب ہجر کے صحرا میں یادوں کی مٹی میں دب جاتے ہیں تب زندگی پھر سے انسان کو زندہ کرتی ہے۔ وہ پھر سے حیات کا جام پی کر زوال

کی رات کا منتظر ٹھہرتا ہے۔

میں نے زندگی کا جام پیا۔ میں نے زندگی میں سکھ کو آب حیات سمجھا۔ جب میں زندگی کی مشکل ترین چوٹی سے گزر رہا تھا تب وہموں نے میرے ذہن کو اپنے شکنجے میں لے لیا۔ میں نے شک کو اپنا ہمراہی بنالیا۔ میں سنور رہا تھا میں بکھر گیا۔ میں حیات کے چشمے پر خوشیوں کے پانی سے نہار رہا تھا تب غم میرے قریب آئے اور انہوں نے میری حیات کے چشمے کے پانی کو سیاہ کر دیا۔ تب دکھوں کا سایہ میرے وجود پر سب سے اونچے درخت کے سائے کی طرح منڈلانے لگا۔

یہ ریگزار، یہ میدان، یہ پہاڑ، یہ چوٹیاں، یہ سبزے۔۔۔۔ میری زندگی میں ان سب کا متضاد ہے۔ میں زندہ ہونے کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ میں سلگ رہا ہوں۔ میں درد کی سیلن زدہ دیوار تھامے صبر کا پیراہن پہنے کتنے عرصے سے وفا کا قرض اتار رہا ہوں۔

اے زندگی اب مجھ پر رحم کر۔۔۔ اب مجھے سکون دے۔ اب میرے جنون کو قرار میسر کر۔۔۔۔ میں تھک گیا ہوں۔ جب بھی شام ڈھلتی ہے یادوں کے جگنو میرے دل کے دروازے پر ہجر کا آلارم بجا دیتے ہیں۔ تب میں ہجر کی تپتی زمین سے اٹھ کر درد کو ہاتھوں سے پکڑ کر دل کی وادی میں لے آتا ہوں۔ میں کتنے لمحے اس سے باتیں کرتا ہوں۔ تبھی آنسو سوغات بن کر میری آنکھوں کے راستے دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ زندگی میں ہر لمحہ قرض ادا کر رہا ہوں۔

میں نے زندگی کو ہمیشہ غموں کی کوٹھری میں بال کھولے آہ و فغاں کرتے دیکھا ہے۔ زندگی ہمیشہ میرے سامنے روتی رہی ہے۔

☆......☆......☆

ارسلان کو پتہ تھا کہ زرینہ عورتوں کے حقوق پر خوب بول لیتی تھی وہ جانتا تھا کہ زرینہ کو لگتا ہے کہ ساری دنیا کے مرد مل کر عورتوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ زرینہ شکل و صورت کے لحاظ سے کافی خوبصورت تھی اس پر اس کا پروقار انداز، شاندار کپڑے اس کی شخصیت کو مزید نکھار دیتے تھے۔ وہ یونیورسٹی کی بہترین مقررہ اور بحثوں کی جان ہوا کرتی تھی۔ ارسلان کبھی غلطی سے اور کبھی جان بوجھ کر اسے ایسے ٹاپک پر لے آتا تھا جو اس کا مضمون ہوتا تھا یعنی

عورت۔ پھر سلگتے رکھ کو چنگاری مل جاتی ہے اسے بھی طاقت مل جاتی تھی۔ یونیورسٹی میں ان کا اکثر کام ہی یہی تھا کہ سیاست سے لے کر سائنس سمیت ہر موضوع پر بحث کیا جائے۔ آج پھر ارسلان اور اس کے درمیاں محبت کے موضوع کو لے کر زوردار ٹاکرہو رہا تھا۔

ارسلان پچھلے کافی دیر سے زرینہ سے محبت کی تشریح پوچھ رہا تھا۔

"زرینہ یار یہ محبت کیا بلا ہے؟"

اکثر اوقات وہ ارسلان کے سوالوں کو نظر انداز کرتی تھی مگر اس وقت اس کا موڈ بھی مکمل جواب دینے کا بن رہا تھا لہذا جب صبر جواب دے گیا تو بول اٹھی۔

"ہاہا۔۔۔۔۔۔ارسلان۔۔۔تم ڈیجیٹل دور کے ڈیجیٹل لڑکے ہو۔تم ایسی باتیں کرتے ہو۔محبت کچھ نہیں تم مردوں کے صرف عورت کے ساتھ تفریح کے بہانے ہیں۔"

ارسلان کو امید تھی وہ ایسا ہی کوئی جواب دے گی لہذا وہ بھی کہاں چپ رہنے والا تھا۔

"یہ تو نرا جھوٹ ہوا میڈم۔۔۔بھلا ڈیجیٹل دور کا انسان محبت نہیں کر سکتا کیا؟"

اس نے اپنا دفاع کرتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں۔۔۔۔۔"

حد سے زیادہ مختصر جواب آیا۔

"کیوں؟"

وہ بھی کہاں ہار ماننے والا تھا۔

"میرا اس وقت بتانے کا موڈ نہیں ہو رہا ہے۔"

زرینہ کے جواب نے ارسلان کو مایوس کر دیا۔

"موڈ نہیں یا جواب ہی نہیں ہے۔"

ارسلان نے جوابی وار کرتے ہوئے کہا۔

"جاؤ پہلے اچھی سی کافی یا چائے لے کر آؤ پھر بتاوٴں گی۔"

زرینہ کہاں ماننے والی تھی۔

"اچھا چائے کا محبت سے کوئی خاص رشتہ ہے۔"

وہ بول اٹھا۔

"ارے بدھو۔ چائے تو محبت کی بنیاد ہے۔ جب بھی لڑکی کو دیکھنے جائیں وہ کیا لے کر آتی ہے۔ ایک بڑے سے ٹرے میں چائے۔ تم جیسے ندیدے تو لڑکی پسند کریں یا نہ کریں چائے اور بسکٹ لازمی کھا کر آتے ہیں۔ دیکھو شاعر جب اداس راتوں کو فضول سی شاعری لکھتے ہیں تو کیا پیتے ہیں، چائے۔

جب دل ٹوٹ جاتے ہیں تو پاکستانی مرد کیا پیتے ہیں۔"

زرینہ نے شاعر کا ذکر کرتے ہوئے ہاتھوں کو کچھ ایسے بلند کر کے اشارہ کیا تھا کہ ارسلان اس کے انداز کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"دیکھو پاکستانی مرد تو سگریٹ پیتے ہیں۔"

ارسلان نے سگریٹ کو فوراً سے پہلے ہجر کا ساتھی قرار دے دیا۔

"اچھا اور عورتیں کیا پیتی ہیں۔"

زرینہ نے فوراً سوال داغ دیا۔

"وہ بھی سگریٹ مگر مڈل کلاس لڑکیاں چھپ کر۔۔۔"

ارسلان کی بات سن کر زرینہ کو غصہ آ گیا۔

"جی نہیں۔ وہ چائے پیتی ہیں۔ بہت سطحی سوچ ہے تمھاری جو ہر عورت کو سگریٹ پر لگا دیا۔ سنو پاکستانی خاتون چائے کے ہر سپ آئے ہائے کر کے پیتی ہیں وہ بھی تم جیسے بے وفا محبوب کو یاد کرتے ہوئے کئی کپ پی جاتی ہیں۔ زرینہ باقاعدہ اٹھ چکی تھی اور ہاتھوں کو لہرا لہرا کر کہہ رہی تھی۔ جانتے ہو تم جیسے سیاں سے جب عورت دل لگاتی ہے تو وہ عشق "چل چھیاں چھیاں" والا موبائل فون ثابت ہوتا ہے۔ اب ہر لڑکی بٹن دبا دبا کر دکھ بھرے گیت سنتی ہے اور ایک دن کسی نام نہاد کنگ کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ جاتی ہیں۔ یہ ہے عشق۔۔۔۔ سمجھے یا نہیں سمجھے۔"

زرینہ نے اٹھ کر تقریری انداز میں کہا تو ارسلان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

زرینہ مکمل بحث کے موڈ میں تھی اور اس وقت اسے خاموش کروانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

"اوہو میڈم، ہر الزام لڑکوں پر۔۔۔ تم بھی تو دیکھو۔ بابا کی پرنسز صاحبہ۔۔۔ آپ تو لڑکوں کو ہی غلط ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ اب اکثر فیس بک پر لڑکیوں کی جاب میں کیا لکھا ہوتا ہے۔

اس نے فوراً سے فیس بک کو بحث میں داخل کرتے ہوئے کہا۔ وہ جب بھی بحث میں ہارنے لگتا تو موضوع کو کہیں کا کہیں لے جاتا تھا۔ حالانکہ فیس بک پر لڑکی کی جاب اور محبت جیسے موضوع میں بالکل بھی مطابقت نہیں تھی۔

"تمھیں پتا ہو۔ لڑکیوں کی پروفائل تم چیک کرتے رہتے ہو اس لیے تمھیں بہتر پتا ہو گا وہ کیا لکھتی ہیں۔"

زرینہ نے چوٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"خیر تمھارا فضول طنز نظر انداز کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ اکثر لڑکیاں جاب میں "فیس بک پر کام کرتی ہوں" کے آپشن کو منتخب کرتی ہیں۔ اب پوچھے تمھیں کیا مارک زکی برگ نے آفس میں ملازمت دی ہوئی ہے کیا؟ یہ ہانڈی اور چولہا بھی فیس بک پر سنبھالتی ہو۔ پھر وہیں سے نام نہاد ارمان پرنس جو ہوتا محلے کا شیدا ہی ہے اس جاب ہولڈر کو دوستوں کی لسٹ میں شامل کرنے کے بعد مانگنے پر اپنے بڑے بیٹے کی تصویر بھیج دیتا ہے۔ جس پر آج کل کی ڈیجیٹل لڑکیاں دل ہار دیتی ہیں۔ فیس بک پر لڑکے کو دس دفعہ قبول ہے قبول ہے کہہ کر جب شادی والے دن اصلی تصویر دیکھتی ہیں تو پتہ چلتا ہے وہ قبول والا چچا غفور تھا اور جس کی تصویر کو قبول کیا تھا وہ اب بیٹا بن کر زندگی بھر ماما، ماما کہتا پھرے گا اور پھر تم لوگ ہجر کے گانے گا گا کر مرد ذات کو بدنام کرتی رہتی ہو حالانکہ بیوقوف تمھیں چچا غفور بنا جاتا ہے۔"

ارسلان کی لمبی چوڑی فضول تقریر ابھی جاری ہی تھی کہ زرینہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر چپ کروا دیا۔

"بس یہاں کوئی مقابلہ نہیں ہو رہا تقریری مقابلہ کا جو تم شروع ہو گئے ہو۔ اتنا فضول بولتے ہو۔ کسی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم کامیڈی کرتے ہو تو بالکل ایسے لگتا ہے جیسے شفقت چیمہ لطیفہ سنا رہا ہو۔"

زرینہ نے غصے سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

" جاؤ جا کر چائے لے آؤ۔" دوسرا حکم فوراً سے پہلے آیا جسے ارسلان نے اسی رفتار سے دوبارہ نظر انداز کر دیا۔ وہ اتنی آسانی سے اٹھنے والا نہیں تھا مگر زرینہ نے بالآخر اسے زبردستی چائے لانے بھیج دیا۔

چائے آنے کے بعد بھی دونوں کی بحث ہنوز ختم نہیں ہوئی تھی۔

" زرینہ۔۔۔"

" مرگئی زرینہ چلے جاؤ اپنی آشا کے پاس۔۔۔"

زرینہ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے داہنے ہاتھ کو ادا کے ساتھ دونوں آنکھوں پر رکھ کر کچھ اس طرح کہا کہ ارسلان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

" آشا بیمار ہے۔"

ارسلان نے ادا سے کہا۔

" ضرور گھونسلے کی چال ہے۔"

جوابی حملہ بھی خوب تھا۔

" چند جملوں کی مار ہے۔"

گویا اب جنگ شاعرانہ انداز میں ہو رہی تھی۔

" تم سے بحث بیکار ہے۔"

زرینہ نے دوبارہ سے ایک ادا کے ساتھ کہا۔

" چلو چھوڑو۔ واقعی سچ بتاؤ تم محبت پر یقین نہیں رکھتی۔" ارسلان نے موڈ بدلتے ہوئے کہا یہی اس میں خوبی تھی کہ وہ کسی بھی شخص کو باتوں سے رام کر لیتا تھا۔

" نہیں یار! یونیورسٹی میں ہی دیکھ لو۔ کینٹین میں سارے دوست بیٹھے کیا کر رہے ہوتے ہیں۔ صرف میسیجز۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں مگر ایک دوسرے کے لیے نہیں ہوتے۔ کیا یہی وہ محبت ہے اور جانتے ہو یہ محبت انہی میسیجز تک ہی رہ جاتی ہے۔ پتہ ہے بعد میں یہی میسیج ہی یاد کرنے کے لئے رہ جاتے ہیں۔ ہر چھ مہینے بعد ایک بریک اپ۔ محبت نہ ہوئی ہر سیزن کی طرح تبدیل ہونے والے فیشنی کپڑے ہو گئے۔ موڈ

خراب ہوا محبوب تبدیل کر لیا۔ بات نہیں بنی نیا رشتہ جوڑ لیا۔ دلوں کو توڑ کر بنائے جانے والے رشتے زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتے۔"

زرینہ کی مدلل باتیں سن کر آخر کار اسے اتفاق کرنا ہی پڑا اور اتفاق کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ بحث کا اختتام ہو گیا ہے۔

☆......☆......☆

بعض اوقات محبتیں درخت پر اگے پھلوں جیسی لگتی ہیں جب چاہا توڑ لیا۔ پھر وہ خود ہنسنے لگا بھلا محبت بھی کبھی پیڑ پر اگ سکی ہے۔ محبت تو سب سے قیمتی پودا ہے جو خاص ہی دلوں کی زمین میں پایا جاتا ہے۔ رات کے نو ہو چکے تھے۔ وہ لان میں ٹہل رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے وجود میں محبت شدید احساس پیدا کر رہی تھی۔ لان میں ہاسٹل کی دیوار کے ساتھ ہی جلتی ہوئی ڈم لائیٹوں اور ٹھنڈی ہواؤں نے ماحول میں عجیب سا اثر پیدا کر دیا تھا۔ وہ ہاسٹل کے خوب صورت لان مین گھاس پر اپنے وجود سے کھیل رہا تھا۔ محبت جیسے ڈم لائٹ کا ماربل کی دیوار پر نظر آنے والا خوبصورت اثر ہے۔ ہمارے وجود میں بھی جب محبت کی ڈم لائیٹ جلتی ہے تو دل کی زمیں پر ایسا ہی خوبصورت منظر تخلیق ہوتا ہے۔

" کیا کر رہے ہو؟"

وہ اچانک جیسے بوکھلا گیا۔ جیسے کسی نے چوری پکڑ لی۔ پلٹ کر دیکھا تو ارسلان سامنے تھا۔

" کچھ نہیں یار۔ طبیعت بوجھل ہو رہی تھی تو لان میں آ گیا۔"

اس نے اکتائے لہجے میں جواب دیا۔ تنہائی شاید انسان کی ابدی ساتھی ہوتی ہے اور وہ کبھی نہیں چاہتا کہ جب وہ تنہائی سے مل رہا ہو تب کوئی اور درمیان میں آئے۔ اسے ارسلان کا آنا قطعی ناگوار گزرا تھا۔

" اچھا تو یہ بات ہے جناب۔ کیا گھر کی یاد آ رہی تھی۔"

ارسلان نے ڈم لائٹ کے آس پاس منڈلاتے پروانوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

" گھر، ارسلان یار! کچھ گھر ہمارے اندر بھی تو ہوتے ہیں۔"

بہت دور سے جواب دیا گیا۔

"اندر تو کچھ بھی نہیں ہوتا دوست۔ اندر کچھ ہوتا تو تم یوں رات کو باہر کیوں ٹہلتے۔ جب اندر خالی ہو جاتا ہے تو وجود باہر کی سیر کرنے لگتا ہے جیسے تم ابھی کر رہے ہو۔" ارسلان بھی اس کی فطرت سے آگاہ تھا لہذا جواب بھی اسی انداز میں دیا۔

"یہ بھی خوب کہی ارسلان میاں! اس نے بظاہر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ جانتے ہو بعض راتیں جاندار ہوتی ہیں۔ مکمل جان رکھتی ہیں۔ وہ بدلے میں ایک انسان کی جان مانگتی ہیں۔"

اس کی بات سن کر ارسلان نے قہقہہ لگایا۔

"جس نے جان لینی ہے وہ دن کو بھی لے لیتا ہے۔ راتیں تو تن کو ڈھانپتی ہیں۔ بھلے وہ تن تنے ہوئے انسان کی ہو یا مرتے ہوئے انسان کی۔۔۔۔"

افتخار نے بھی جواباً مصنوعی قہقہہ لگایا۔ جب کہ اداسی قہقے میں مکمل عیاں تھی۔

"خیر یہ بتاؤ تمھاری نیند کس نے خراب کی۔ اچھے بھلے سوئے ہوئے تھے۔"

دوبارہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے ارسلان سے سوال ہوا۔

"میری نیند ایک عدد بدتمیز دوست افتخار احمد جو کہ بہت ہی پیاری سی خاتون گل بی بی کے بیٹے نے خراب کی۔ وہ راتوں کو چاند کے ہمراہ ہاسٹل کے لان میں ٹہلتا ہے۔ اپنے راز اپنی ذات تک رکھتا ہے۔ اسے لگتا ہے ارسلان سو جائے تو وہ جاگ جائے گا مگر وہ نہیں جانتا ارسلان سوتے ہوئے بھی جاگ رہا ہوتا ہے۔"

ارسلان نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو افتخار نے نا چاہتے ہوئے بھی نظریں جھکا لیں۔

"چلو یار تھوڑا واک کرتے ہیں۔"

جانے افتخار کو کیا سوجھی لہذا موضوع پلٹ کر ارسلان کا ہاتھ پکڑ کر چھوٹے لان کے چکر لگانے لگا۔ شاید وہ اپنی سوچوں سے فرار چاہتا تھا۔ وہ ارسلان سے اپنی ذات کے سب سے بڑے سچ کو چھپانا چاہتا تھا۔ سب سے بڑا سچ جو ہمیشہ جھوٹ کے پردے میں آس پاس پھرتا رہتا ہے۔ سوائے افتخار کے وہ سچ سب کے لیے جھوٹ ہی تھا۔



یونیورسٹی میں مڈٹرم پیپر ہو رہے تھے۔ تینوں ہی تیاریوں اور امتحانات میں مصروف تھے۔ امتحانات کے دنوں میں وہ اکثر ایک دوسرے کو بھی نظر نہیں آتے تھے۔ دراصل ارسلان، زرمینہ اور افتخار مسابقے کی دوڑ میں اول آنا چاہتے تھے۔ ہر کوئی چاہتا تھا وہ دوسرے کو پچھاڑ دے۔ تین بہترین دوست امتحانات کے دنوں بدترین دشمنوں جیسے ہو جاتے تھے۔ آج ارسلان کافی تھک چکا تھا۔ آخری پیپر تھا۔ مڈٹرم کے بعد کم از کم ایک ہفتے کے لیے وہ گھر لازمی جاتا تھا۔

پچھلے تین سال سے اس کا یہ بھی معمول تھا کہ پیپر دینے کے بعد سید ھا بس اڈے کی جانب پاگلوں کی طرح روانہ ہوتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ کسی قید سے رہا ہوا ہو۔ وہ اسلام آباد میں ہی رہتا تھا۔ اس کے والد مسٹر وقار پچھلے کئی برسوں سے ہسپتالوں کو مشینوں اور آلات فراہم کرنے کا کاروبار کرتے تھے اگرچہ انہوں نے اسے کافی قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ اسلام آباد میں ہی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے مگر لاہور جیسے اس کا جنون تھا۔ میٹرک بھی اس نے لاہور سے ہی کیا تھا پھر والد کاروبار کی وجہ سے لاہور کا گھر بیچ کر اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ اگرچہ وہ لاہور سے گئے تھے مگر لاہور ارسلان کے دل سے نہ جا سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یونیورسٹی کے لیے پھر پلٹ کر لاہور آن پہنچا تھا۔

پانچ گھنٹوں کی مسافت کے بعد بالآخر وہ گھر کے دروازے پر تھا۔ دل جیسے بلیوں اچھل رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا لہٰذا چپکے سے آواز نکالے بغیر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کمرے کے بیڈ پر نیم دراز تھا۔ وہ اکثر ایسا کرتا تھا۔ چپ چاپ گھر داخل ہوتا اور تھوڑی دیر بعد ماں کے سرہانے سرپرائز کہہ کر پہنچ جاتا اور ان کا دل جیسے اسے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا تھا۔

"نہ سلام نہ دعا! یہ ہوتی ہے آج کل کی نسل۔"

آنے والی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کی ماں چائے کا مگ ہاتھوں میں پکڑے اس کے سرہانے کھڑی تھیں۔

"السلام علیکم میری پیاری مادر گرامی! سلام کے بعد عرض ہے کہ بندہ ناچیز پہنچ گیا۔ راستے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ نہ کسی سے کوئی چیز لے کر کھائی البتہ راستے میں کھانا کھا لیا تھا۔ بالکل خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ آپ کی

خیریت مطلوب چاہتا ہوں۔ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے میری سرپرائز کا بیڑہ غرق کر دیا۔"

"بس بس۔ تم بھی نا لڑکے باز نہیں آؤ گے۔"

ماں نے اسے مصنوعی ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

"بہت بدتمیز ہو۔ کب آتے ہو جاتے ہو۔ پتہ ہی نہیں چلتا۔ نہ ماں سے ملتے ہو۔ کہاں ہوتے ہو؟ وہ ارسلان کی ماں تھیں لہذا وہ بھی اس کی فطرت سے بخوبی آگاہ تھیں۔ کتنے عرصے بعد وہ ان کے پاس آیا تھا لہذا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے ڈھیروں شکایتیں کریں۔

"مما! معذرت چاہتا ہوں۔ زیادہ تھک گیا تھا۔ اسی لیے سیدھا کمرے میں آن وارد ہوا تھا۔ مگر آپ نے سرپرائز کا۔۔۔"

وہ کہہ رہا تھا کہ ماں نے روک دیا۔

"نہیں بیٹا! ماں کے لیے سب سے بڑا سرپرائز تو ہی ہے۔ افتخار سے بات ہو گئی تھی۔ اس نے بتا دیا تھا کہ تم نکل چکے ہو۔"

ماں نے اسے ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"اوہو تو یہ افتخار تھا جس نے آپ کو میری آمد سے باخبر کیا۔"

"جی وہی تھا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا! وہی میرا دشمن جاں! ہاں وہی جسے جاں کہتا تھا، وہی قاتل جاں نکلا۔"

اس نے شاعرانہ انداز میں کہا تو وہ زور سے ہنس دیں۔

"فضول اور بے تکی باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ پیپر کیسے ہوئے۔

ماں نے شفقت سے پوچھا۔ چائے کا مگ ارسلان کے سامنے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا گیا تھا۔ چائے کا مگ دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ ماں نے خلوص اور محبت کی آمیزش سے کتنی دیر پہلے یہ چائے بنائی ہوگی اور راستے پر نگاہیں بچھا کر اس کی منتظر رہی ہوں گی۔

"میری ماں کی دعا سے ماں کے مکھڑے جتنا حسین ہی ہوا ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ مسز وقار کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔"

انہوں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کتنی دفعہ کہا ہے سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر نہ آیا کریں۔ کسی ملازم کے ہاتھوں چائے بجھوا دیتیں یا مجھے بلا لیتیں۔

تم بھی فضول سرپرائز سے باز آیا کرو نا لاڈلے صاحب! اور یہ کتنی دفعہ کی بات بھی خوب کہی۔ صاحب پہنچے ہی ابھی ہیں جتلانے لگے ہزاروں دفعہ کی محبتیں۔ انہوں نے اس کے سر میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔

"جائیں میں نہیں بولتا۔ آپ کو اپنی صحت کی پرواہ ہی نہیں۔"

اس نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے اتنی بے اعتنائی۔۔۔ لاڈ صاحب کے لاڈ بھی ماں ہی اٹھائے گی نا۔ میں نہ آتی تو ماں کا حسین مکھڑا کیسے دیکھتا میرا چندا۔"

انہوں نے چائے کا مگ اس کے قریب کرتے ہوئے پیار سے کہا۔

"نہیں مما۔ آپ نے میری دوپہر خراب کر دی۔ میں نے سوچا تھا کہ تھکن اتارنے کے بعد اپنی پیاری سی ماں کے ساتھ ایک خوب صورت سی دوپہر بتاؤں گا۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے دوستوں کی باتیں کروں گا۔ آپ نے میرے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔"

اس نے دوبارہ سے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے پیار سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔

"چلو اٹھو اور ڈرامے چھوڑ کر چائے پیو۔ مکمل ایکٹر ہی بن گئے ہو۔" انہوں نے مگ سامنے رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

"آپ کے شوہر نامدار عرف عام میں میرے والد بزرگوار اس وقت کہاں تشریف فرما ہیں۔ موصوف پورے گھر میں طمطراق سے ٹہلتے تھے مگر آج کہیں نظر نہیں آ رہے۔"

اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے والد کے متعلق مغلیہ انداز میں کہا تو وہ جیسے اسے دیکھ کر جی اٹھیں۔اس کی ہر حرکت، ہر ادا انہیں زندگی کا احساس دلاتی تھی۔

"بیٹا جی! وہ اس وقت آفس میں تشریف فرما ہیں۔تھوڑی دیر پہلے کال آئی تھی۔تمھارا پوچھ رہے تھے۔"

"آہ! پیپر کے دنوں بابو کو یہ دیوا اتنا کیوں یاد آتا ہے اے ماں!"

ترنم سے کہے گئے جملوں کے جواب میں ماں کا محبت سے بھرپور چپت اس نے اپنے سر پر وصول کیا۔

"مسٹر دیوا! اگر تمھاری ایکٹنگ ختم ہو چکی ہو تو چائے پی کر جلدی سے نیچے آ جاؤ۔تھوڑی دیر میں رات کے کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔"

مسز وقار کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ پیپر ختم ہونے کی خوشی میں ماں سے مکمل شرارت کرنے کے موڈ میں ہے۔

"جو حکم عالی جاہ! اے ملکہ حسن! بادشاہ مسٹر وقار کی حسین دوشیزہ۔۔۔۔آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ بندہ ناچیز تھوڑی دیر میں حاضر ہوا چاہتا ہے۔"

اس نے فرشی سلام کرتے ہوئے ماں سے کہا تو انہوں نے جانے میں ہی عافیت جانی۔

ارسلان ان کی واحد اکلوتی اولاد تھی۔وہ انہیں اپنی سب سے بڑی دریافت کہتی تھیں۔وہ ان کے لیے محبت کا آب گوہر تھا۔اسے دیکھ کر جیتی تھیں۔اگرچہ پچھلے دو سالوں سے وہ دل کی مریضہ تھیں۔بلڈ پریشر کسی بھی وقت بڑھ جاتا تھا مگر ارسلان ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ دل سے ان کا خیال رکھے۔انہیں خوش کرنے کے لیے ہر قسم کے جتن کرتا رہتا تھا۔مائیں محبتوں کی امین ہوتی ہیں۔وہ چراغ میں جلتے ہوئے روشن دیئے کی طرح ہوتی ہیں جو خود تو جل جاتی ہیں مگر اولاد ان کی روشنی سے کامیابی پا لیتی ہے۔

☆......☆......☆

محبت حوادث میں سے دریافت شدہ سب سے بڑا حادثہ ہے۔جب محبت دل کی بنجر زمین پر اگتی ہے تو انسان کا انگ انگ اس محبت کی مہک سے مہک جاتا ہے۔سب نظارے محبت کی وجہ سے تو روشن ہیں۔روشن چاند راتوں کو آسماں کی بلندیوں میں نور کے ہالے برساتا ہے تبھی کوئی کھلی کھڑکی سے اس چاند میں اپنے وجود، اپنے محبوب کو تلاشتا ہے۔ہر شے محبت کے زیر اثر ہے۔کتنی دیر وہ اپنی سوچوں کے زیر اثر رہا۔تبھی وہ اٹھا۔

نل سے بہتے پانی کی مدد سے چہرے کو دھویا اور دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کر پانی کو وجود میں پہنچانے لگا۔ وہ اکثر ایسے ہی پانی پیتا تھا۔ تبھی وہ خود سے گویا ہوا۔

"دیکھو نا! محبت کے سوا بھی ہر سو محبت ہی ہے۔ بہنے والے پانی کو ہاتھوں میں اٹھا کر پیو تو اس کی روشن کرنیں پورے وجود کے ساتھ جسم کو محبت کی طاقت سے منور کرتی ہیں۔ یہ پانی ٹپ ٹپ عشق کے راگ پر برستے نغموں کی طرح وجود کے اندر تک اتر جاتا ہے۔ یہ پانی بھی تو انسان سے محبت کرتا ہے۔ اس نے ہاتھوں میں پانی بھرا اور پھر سے غٹا غٹ پینے لگا۔

تبھی وہ باہر کی جانب لپکا۔ اس کی آنکھیں ہجر کے صحرا میں وقت کی مٹی کے اندر دھنسے انسان کی آنکھوں جیسی لگ رہی تھیں۔ وقت کا آسمان یادوں کے بادلوں سے بھر چکا تھا ایسا لگ رہا تھا کسی بھی وقت آنسوؤں کی بارش پھر اسے فراق کی وادی میں لے کر جائے گی۔ وہ کھلے فضا میں چلانے لگا۔

سنو پرندو! مگر تم تو سو چکے ہو۔ سنو فضاؤ مگر تم تو مجھ میں گم ہو چکے ہو۔ سنو نظارو مگر تم تو اندھیروں میں کھو چکے ہو۔ کوئی تو سنے۔ دیکھو محبت کا راگ ساری رات گایا جائے تب بھی ذہن اس کے اثر سے باہر نہیں نکلتا۔ ہجر کی تلخی ،محبت کی سب سے بڑی بے بسی کی علامت ہے۔ جب محبت بے بس ہو جاتی ہے تو وہ مرض بن جاتی ہے۔ اس نے کتنی دیر کھلی فضا میں آسماں کو دیکھتے خود سے باتیں کیں۔ آخر تنگ آگیا تو اٹھ کر دوبارہ کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

زرینہ شہر کے مشہور بزنس مین وقاص رحمانی کی بیٹی تھی۔ دو بھائیوں کی لاڈلی بہن جس نے بچپن سے ہی ہر قسم کا سکھ دیکھا تھا۔ وہ سب کی آنکھوں کا تارا بن کر رہتی تھی۔ والدین، بھائی، رشتے دار یہاں تک کہ دوست، سب ہی اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ اگرچہ وقاص رحمانی نے اسے مینجمنٹ کے لیے باہر کی کسی یونیورسٹی بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا مگر زرینہ کی ضد تھی کہ وہ یہیں سے تعلیم حاصل کرے گی۔ وہ شروع سے پڑھائی میں بہترین رہی تھی۔ اسے امیر ہونے کا بالکل بھی زعم نہیں تھا اسی لیے افتخار بھی اس کے دوستوں کی لسٹ میں تھا۔ وقاص رحمانی مینوفیکچرنگ شعبے سے وابستہ تھے۔ وہ بزنس چین کے مالک تھے۔ ان کے مختلف شہروں میں سپر سٹور بھی

تھے۔اس کے علاوہ فرنیچر سے لے کر فوڈ بزنس تک سب میں انہوں نے اپنا لوہا منوایا تھا۔

زرینہ ایک عملی لڑکی تھی۔وہ خیالی دنیا میں کم ہی رہا کرتی تھی۔اس کا ارادہ تھا کہ پڑھائی کے بعد وہ بھی والد کے ساتھ کاروبار میں اپنی صلاحیتیں منوائے گی۔وہ غریب پرور تھی۔وہ اکثر غریبوں کی مدد بھی کیا کرتی تھی مگر اس نے کبھی غریبی کو پسند نہیں کیا تھا۔وہ کھلے عام کہتی تھی کہ غریبی جس دن کسی چھپے بھیس میں اس تک پہنچے گی تو وہ اسے دس لاتیں مار دے گی۔وہ اکثر غریبوں کو بھی کوستی رہتی تھی کہ وہ اپنے حالات کسی طور بدلنے کو تیار نہیں ہوتے۔وہ ایک ہی کیفیت میں زندگی گزار دیتے ہیں۔زندگی بھر سڑکوں کے کنارے چند گاڑیوں سے نکلتے سرمئی اور کالے دھوئیں کے ہمراہی بن کر وہ ایک بے کیفیت زندگی گزار دیتے ہیں۔اس کا دکھ غریبوں کی غریبی تھا۔یونیورسٹی میں اگرچہ بہت سے لڑکوں نے اس سے دوستی کرنے کی کوشش کی اور اس کے دل تک رسائی حاصل کرنے کی اپنی جانب سے ہر ممکن کوشش کی مگر وہ جانتی تھی کہ اس سب کے پیچھے وقاص رحمانی کی دولت کی خوشبو بسی ہے۔اسی لیے اس نے چن کر افتخار اور ارسلان کو ہی یونیورسٹی دوست کے طور منتخب کیا تھا۔اگرچہ بہت سی لڑکیاں بھی اس کی اچھی دوستوں میں شمار ہوتی تھیں مگر ان دونوں کے علاوہ اس نے کسی لڑکے کو اپنے نزدیک آنے نہیں دیا تھا۔ تینوں کی دوستی مثالی دوستی تھی۔پوری کلاس میں ان کی دوستی کے چرچے تھے۔اکثر افتخار اور ارسلان بے دھڑک زرینہ کے گھر چلے جاتے تھے اور زرینہ کو انہیں وی وی آئی پی پروٹوکول دینا پڑتا تھا۔خوب ساری تواضع کے بعد وہ قریبی فریج میں موجود اشیا پر بھی ہلہ بول دیتے تھے جب کہ گھر میں کسی کی جرات نہیں تھی کہ وہ زرینہ کے دوستوں کو اس بدتمیزی سے روکے۔یہی اس رشتے کی خوب صورتی تھی کہ عمومی روئے بھی انہیں خاص پہچان عطا کر دیتے تھے اور وہ دوستی کی خوشبو سے نکھر جاتے تھے۔

☆......☆......☆

رات ہوتے ہی تنہائی اس کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھی۔کمرے کی کھلی کھڑکی سے باہر دیکھتا تو اسی کا عکس نظر آتا۔آنکھیں بند کرتا تو اس کے ساتھ کی جانے والی باتیں کانوں میں دور سے آتی محسوس ہوتیں۔ وہ چھت کی جانب دیکھنے لگا۔گھومتے پنکھے کے پروں میں اسے اپنی ذات کا ساگماں ہونے لگا۔محبت میں وہ بھی اسی کے گرد گھوم رہا تھا۔اسی کے ذات کے گرد روز گھومتا۔وہ اس کی ذات میں روز رہنے کے لیے چلی آتی۔اس

سے ڈھیروں باتیں کرتی۔ وہ اسے دنیا سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے خود سے سرگوشی کی۔ محبت گناہ ہے یہ انسان کو ہجر کی صلیب پر چڑھا دیتی ہے۔ میں نے بھی گناہ کیا ہے۔ دیکھو میں نے بھی محبت کی ہے۔ اب ہجر کی وادی میں سلگتے رہنا شاید میری قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔

تنہائی نے بری طرح اسے اپنے غلبے میں لے لیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا مگر اس کا ذہن اوہام کے پردوں میں کہیں گم ہو رہا تھا۔ محبت الہام کی صورت اس کے رگ و پے میں بس چکی تھی۔ روز رات کو اس کے وجود پر محبت کی آمد ہوتی اور وہ دیوانوں کی طرح سڑکوں پر محبت کی خاک چھانتا رہتا۔ کہیں دور کتے کی چلانے کی آوازیں اور اندھیری رات کا خوف اسے دوبارہ کمرے میں لے آتا تبھی وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر کتنی دیر بلاوجہ گھومتا رہتا۔ سوچیں جانے اسے کہاں لے جاتیں مگر وہ کسی لمحے کمرے میں حاضر نہ ہوتا۔ وہ غائب ہوتا۔ محبت کرتی بھی ایسا ہی ہے۔ حاضر کو غائب کر دیتی ہے۔ محفل کو تنہا اور ہجوم کو اکیلا کر دیتی ہے۔

وہ اٹھا۔ واش روم میں شیشے کے سامنے اپنے آپ کو دیکھنے لگا۔ اپنے آپ کو ڈھونڈنے لگا مگر جو شخص اپنی ذات میں کھو گیا ہو وہ اتنی آسانی سے کہاں ملتا ہے۔ جس کی ذات میں بسیرا ہی کسی اور کا ہو وہ کسی اور کو کہاں ملتا ہے۔ پانی کی چھینٹیں منہ پر مارنے کے باوجود وہ نارمل نہ ہوا۔ لہٰذا کمرے میں موجود الیکٹرک کیتل میں اپنے لیے چائے بنائی اور باہر نکل گیا۔ کتنی دیر سبز گھاس سے بلاوجہ کھیلتا رہا۔ محبت میرے ساتھ بھی ایسے ہی کھیل رہی ہے۔ میرے وجود کا ایک ایک حصہ گھاس کی طرح الگ ہو رہا ہے۔ میں فرار چاہتا ہوں مگر محبت مجھے باندھ کر پھر وہیں لے جاتی ہے۔ اندھیری رات، چائے اور یادیں۔۔۔ محبت میں بھٹکے انسان نے کب تک یونہی بھٹکے رہنا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆......☆......☆

یونیورسٹی میں کافی چہل پہل تھی۔ ارسلان کینٹین میں بیٹھا ہوا تھا کہ تبھی افتخار بھی آن وارد ہوا۔

"ہیلو لڑکے!"

اس نے ارسلان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"کیسے ہو افتخار!"

ارسلان نے خوشدلی سے استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہوں۔تم کب واپس آئے۔"

"صبح آٹھ بجے پہنچا تھا۔ڈائریکٹ یونیورسٹی آ گیا۔مگر ابھی پتہ چلا کہ کلاس کا وقت تبدیل ہو چکا ہے۔"

"ھاں یار!ہمیں بھی یونیورسٹی آ کر علم ہوا۔گھر میں سب ٹھیک ہیں نا۔۔آنٹی!انکل۔۔۔"

افتخار نے سب کی خیریت دریافت کی۔

"ہاں میرے بھائی۔امی تو تمھارا پوچھ پوچھ کر تھک گئیں۔کہتی تھیں کبھی اسے بھی لے کر آؤ۔اس پڑھاکو کو۔۔ میں نے کہا پڑھاکو میں ایسا کیا ہے سوائے لمبی ناک کے۔۔۔۔۔"

ارسلان نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"جیلس انسان!جلو۔میرے لیے تو آنٹی ماں سے بڑھ کر ہیں۔کچھ جلنے کی بو نہیں آ رہی ارسلان۔"افتخار نے ناک پر ہاتھ رکھا تو ارسلان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ارے کہاں یار!جلوں گا اور وہ بھی تم سے!جلے ہوئے ٹائر سے بھی کوئی جلا ہے۔"

ارسلان نے پھر چوٹ کی۔

"آنٹی سنئے۔ایک لڑکا ہے۔وہ مجھ سے اس لیے جلتا ہے کہ میری ماں جیسی آنٹی کیوں مجھے ارسلان سے بڑھ کر پیار کرتی ہے۔"

افتخار بھی کہاں باز آنے والا تھا۔

"ھاھاھا مجھ سے بڑھ کر!"

ارسلان نے زوردار قہقہہ لگایا کہ آس پاس ٹیبل پر بیٹھے طالب علم انہیں گھورنے لگے۔

ھاں یہ لو منے ہاجمولا کی گولیاں کھالو۔تم سے ویسے بھی میری تعریف کہاں ہضم ہوتی ہے۔ہاجمولا کھالو شاید کھانا ہی ہضم ہو جائے۔"

ابھی دونوں کی لڑائی جاری ہی تھی کہ زرینہ بھی آن پہنچی۔

"شیطان کو یاد کیا اور وہ آن پہنچا۔ارسلان نے اسے دیکھتے ہوئے کہا جب کہ افتخار نے ارسلان کی طرف

غصے سے دیکھا۔"

"کیسے ہو شیطان کے نانا!"

زرینہ نے جوابی حملہ کیا۔

"ہم ٹھیک ہیں۔آپ کیسی ہیں۔"

دونوں نے پھر سے ایک آواز میں کہا۔

"بس کرو۔کینٹین ہے تمھارا گھر نہیں۔جو اتنا شور مچا رکھا ہے"

زرینہ نے ہونٹ بھینچتے غصے سے کہا۔

"چلو کچھ منگواؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔سیدھا یونیورسٹی آیا ہوں۔" ارسلان نے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے اٹھ کر کھانے کی چیزیں لانے میں ہی اپنی عافیت جانی۔

تینوں کی محبت ایسی ہی تھی۔ان کی لڑائی، ان کے جھگڑے کسی کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ایک دوسرے سے رقابتیں، ایک دوسرے سے امتحانات کے دنوں دوریاں اور یونیورسٹی میں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہنا۔ایک دوسرے کے ہاتھوں کھانا۔۔۔بغیر لحاظ کوئی بھی ضرورت کی چیز مانگ لینا۔شاید کم لوگوں کو ایسے دوست نصیب ہوتے تھے۔



رات کے بارہ ہو چکے تھے۔ہر سو گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے انسان قبروں میں لیٹ چکے ہیں۔کتنی دیر سے لان میں ٹہلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اندھیرا لفظوں کو اور لہجوں کو نگل جاتا ہے۔ اندھیرا اجالے کے لیے ہجر کا پیغام بن کر آتا ہے۔اسی اندھیرے میں انسانی وجود پر سکون کی اوس پڑتی ہے۔یہی اندھیرا راتوں کو ذہن کے دریچوں پر یادوں کے باکسز کو کھول کر دکھ کی بارش برساتا رہتا ہے۔

وہ اپنے خیالات میں مگن تھا کہ "کیا کر رہے ہو؟" کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

پیچھے مڑ کر دیکھا تو ارسلان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ تمھیں کون سا جن چمٹ گیا ہے۔جو آدھی رات کو لان میں ٹہلنے کے لیے نکل آتے

ہو۔" ارسلان نے تقریباً اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اور میری بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی بلا خواب میں آ کر تمھیں میرے لان میں ہونے کی اطلاع دیتی ہے جو تم آدھی رات کو یہاں چلے آتے ہو۔"

افتخار نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"اس بلا کا نام دوستی ہے۔ وہی مجھے سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ آج تو جان کر ہی تمھاری جان چھوڑوں گا کہ آخر کس کی یادوں میں لان کی گھاس پر جوتوں کو گھسیٹتے رہتے ہو۔"

ارسلان نے بھی ٹھان لیا تھا کہ وہ آج وجہ جان کر رہے گا۔

" کوئی بات نہیں۔۔۔تم سو جاؤ۔"

افتخار نے نظریں چراتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

" یہ تمھاری جو کوئی بات نہیں ہے نا اسی میں ساری بات ہے۔ اب شرافت سے مجھے بتاتے ہو یا آنٹی کو فون کروں کہ آپ کا بیٹا ڈیجیٹل مجنوں بن چکا ہے۔"

ارسلان نے اسے دھمکی والے انداز میں کہا تو وہ سٹپٹا گیا۔

"اب ہر بات میں اماں کو لانا لازمی ہوتا ہے کیا؟"

اس نے گھبرائے لہجے میں جواب دیا۔

"ابا اور ابا کا جوتا دونوں ہی تمھیں لائن پر رکھ سکتے ہیں۔ چلو بتاؤ۔ کیا ہوا ہے۔ کیا معاملہ ہے۔ شرافت سے بتاؤ۔"

ارسلان کو یقین ہو چکا تھا کہ اس کی جھوٹی دھمکیوں کے بعد افتخار اسے سب سچ بتا دے گا۔

"ارے یار کچھ بھی نہیں۔ بس گھر یاد آ رہا ہے۔ گھر، امی، ابو بہن بھائی سب یاد آ رہے ہیں۔ تم بھی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہو۔"

افتخار نے جیسے کچھ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے گول مول سا جواب دے دیا۔

"میرے پیارے دوست۔۔۔امی ابو کو یاد کرتے ہوئے کوئی لان میں راتوں کو جنوں کی طرح نہیں ٹہلتا۔

نیلے ہلکے کالے آسمان تلے دبیز تنہائی کی اوٹ میں خود سے باتیں نہیں کرتا۔جھوٹ بول لیتے ہو مگر تمھارا جھوٹ بھی تمھارے سچ کی طرح کمزور ہی ثابت ہوتا ہے۔"

ارسلان نے اب کھل کے اس پر حملہ کر دیا تھا جس کے بعد اسے قوی امید تھی کہ بھلے کچھ ہو نہ ہو دل میں موجود کوئی پیچیدہ راز اس کے سامنے ضرور عیاں ہوگا۔

"ارسلان!"

وہ جیسے خلاؤں سے بولا۔

"بولو افتخار میں یہیں ہوں۔"

"یہیں، یہیں کہاں؟ میں تو ایکٹنگ بھی اچھی نہیں کر سکتا۔سوچا تھا تم سے چھپا لوں گا۔سوچا تھا اسے ہر کسی سے چھپا لوں گا۔صرف دل کے کونے میں ہی بسا کر رکھوں گا۔دنیا کے سامنے اسے کبھی نہیں لاؤں گا۔یونیورسٹی کے پانچ سمسٹر میں جس طرح اسے چھپا کر رکھا یہ آخری تین سمسٹر بھی بس وہ دل کے سب سے رازدار حصے میں سب سے چھپ کر رہے گی۔"

اس کی آواز کا ارتعاش اور لہجے کی شکست سے اندازہ ہو رہا تھا کہ پچھلے تین سال سے وہ کتنا ٹوٹ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے افتخار؟ کس کی بات کر رہے ہو۔کس کو چھپا رہے تھے اور کیوں چھپا رہے تھے۔"

اب کہ ارسلان متفکر تھا۔اپنے قریبی دوست کو اس حالت میں دیکھ کر وہ واقعی شدید تذبذب کا شکار تھا۔

"ارسلان مجھے محبت ہو گئی ہے۔"

افتخار نے اچانک بم پھوڑا۔

"محبت۔۔۔کس سے محبت۔۔۔۔"

اس کی نگاہوں میں شدید حیرانی کے ساتھ بہت سے سوالات تھے۔

"مگر مجھے لگتا ہے شاید وہ مجھے کبھی نہیں چاہ سکتی۔افتخار کے لہجے میں شکست ہی شکست نظر آ رہی تھی۔

"کس کی بات کر رہے ہو۔بتا کیوں نہیں دیتے کون ہے؟"

ارسلان نے شدید الجھتے ہوئے کہا۔

"زرینہ۔۔۔۔"

افتخار نے ایک دم اس کا نام لیا تو ارسلان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"زرینہ!تم نے یہی نام لیا نا۔"

ارسلان جیسے غیر یقینی صورت حال کا شکار تھا۔

"ہاں یہی نام۔۔۔ مجھے معلوم تھا تم حیران ہو گے۔تین سال میں اپنی خاموش محبت میں خود سے الجھتا رہا۔ دیکھو ارسلان زرینہ میرے وجود میں کسی رزم کی طرح شامل ہو گئی ہے۔میری اکثر شامیں تنہائی میں اسی کے ساتھ وقت گزارتی ہیں۔وہی زرینہ جو ہماری بہترین دوست ہے۔"

وہ کہتا جا رہا تھا مگر ارسلان جانے کہاں پہنچا ہوا تھا۔اس کے سب سے بہترین دوست کو اس لڑکی سے محبت ہو گئی تھی جو محبت کو کائنات کا سب سے فضول جذبہ کہتی ہے۔ارسلان جانتا تھا جتنی محبت افتخار نے کتابوں سے کی ہے اب کہ زرینہ سے بھی اتنی شدت سے محبت ہی کی ہو گی۔لیکن ارسلان یہ بھی جانتا تھا کہ اونچی ذات کی کرسی پر بیٹھی زرینہ لوئر مڈل کلاس کے افتخار کو دوست تو بنا سکتی ہے مگر زندگی کا ساتھی کبھی نہیں۔

تھوڑی دیر بعد اس کے اوسان بحال ہوئے۔وہ افتخار کی طرف مڑا۔

"مگر افتخار تم اسے جانتے ہو نا۔"

اب ارسلان کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

"ہم۔۔۔"

وہ دبی مسکراہٹ میں ارسلان کو دیکھنے لگے۔

جانتا ہوں اسی لیے آج تک وہ دل میں موجود تھی۔میں اسے جانتا تھا اسے لیئے کسی کو اپنی ذات تک رسائی نہیں دے رہا تھا۔مجھے ڈر تھا کہ کہیں کوئی میری ذات میں اسے نہ پڑھ لے۔میں یہ بات بھی جانتا ہوں کہ اس دور میں محبت سب سے ارزاں جذبہ ہے۔جس نے اپنی ہیئت تبدیل کر لی ہے۔اب محبت کی شکل روز بدلتے موبائل فون جیسی ہو گئی ہے۔محبت سمارٹ فون کی طرح خوبصورت ہو گئی ہے مگر اس محبت کی عمر بھی نئے فون کی طرح ایک یا دو سال ہی ہے۔میں نے کسی بدلے میں اپنے آپ کو اسی لیے نہیں بدلا کہ کل کوئی یہ نہ کہہ دے کہ تم

اپنی محبت کا بدلا چاہتے تھے۔۔۔۔۔۔"

افتخار بول رہا تھا مگر ارسلان الگ دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔انسان بمقابلہ معیارات کی دنیا۔۔۔جہاں انسان کی حیثیت معیار کے سامنے چیونٹی کے برابر بھی نہیں تھی۔تبھی اس نے دیکھا کہ افتخار اسے خاموش پا کر کمرے کی جانب بڑھ رہا ہے۔

"افتخار۔۔۔"

ارسلان نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا دوست۔۔۔لفظوں کو ادھورے راستے میں چھوڑنا مجھے نہیں پسند۔۔۔ایسا لگتا ہے جیسے کوئی چیز ادھوری رہ گئی ہو۔"

افتخار کو اچھا نہیں لگا تھا اور اسے کبھی اچھا نہیں لگتا تھا جب کوئی اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے لفظوں کو راستے میں روک لے۔

"رک جاؤ۔شہر کے مشہور بزنس مین وقاص رحمانی کی بیٹی ہے زرینہ۔۔۔پورا نام جانتے ہو نا اس کا۔۔۔"ارسلان نے اسے ڈراتے ہوئے تنبیہ کی۔

"پورا نام تم نہیں جانتے۔زرینہ رحمانی کے باپ کو دیکھ کر محبت کرتا تو دل لفظ رحمانی پر رک جاتا۔میرا دل سیڑھیاں نہیں چڑھا بلکہ دل میں وہ چڑھ گئی ہے۔کیسے روک پاتا۔سیڑھیاں چڑھ کر محبت کرتا تو سامنے رحمانی صاحب کو دیکھ کر پلٹ آتا۔

افتخار نے اذیت ناک لہجے میں جواب دیا۔

"وہ کبھی نہیں مانے گی۔تم بہت قابل ہو۔مگر جانتے ہو نا وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں جو کسی عام سے لڑکے کے ساتھ محبت کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر چھوٹے سے مکان میں شفٹ ہو جاتی ہیں۔یہ جدید لڑکی ہے۔یہ محبت میں لڑ تو سکتی ہے مگر محبت میں کسی غریب کے گھر مر نہیں سکتی۔"

ارسلان نے جذباتی انداز میں اسے حقیقت کا ادراک دلانے کی کوشش کی۔

"میں نے کبھی توقع بھی نہیں کی کہ وہ مان جائے۔بس یہ چاہتا ہوں کہ محبت اس سے پہلے مجھے مان جائے تو

مرتے وقت بھی ماں کے بغیر نہیں مروں گا۔"

افتخار نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو ارسلان کے جیسے دل پر کسی نے وار کر دیا۔ دوست کو اس حالت میں دیکھنا سب سے تکلیف دہ امر تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ افتخار ادراک کی منزلیں طے کرے۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ محبت ادراک کی حقیقت سے نا آشنا اپنی ایک الگ حقیقت رکھتی ہے۔ محبت جب تک نہیں ہوتی تب تک دل ہر قسم کی دلیلوں کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے مگر جب محبت کی آگ دل میں بھڑک اٹھتی ہے تو یہ دلیل اور عقل کو بھی جلا کر رکھ دیتی ہے۔ محبت وہ جن ہے جو چمٹ جائے تو جان لے کر جان چھوڑتا ہے۔ وہ محبت میں بہک گیا تھا۔ ارسلان نے اگرچہ اس کے دل تک رسائی حاصل کر لی تھی مگر وہاں سے حاصل سچ کو لا حاصل اور دیوانے کا خواب سمجھ کر وہ اسے کتنی دیر سے سمجھانے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا مگر وہ محبت ہی کیا جو سمجھ بوجھ کے دائرے میں قید ہو سکے۔



نا جانے کس لمحے وہ اسے محبت کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ نا جانے کس لمحے اسے وہ خاص لگنے لگی۔ وہ جو سب سے خاص تھی اس کے لیے کب سے اتنی خاص ہو گئی کہ وہ عام لفظ کے دائرے سے نکل گیا۔ وہ یونیورسٹی کے لان میں بینچ پر بیٹھے اسی کے بارے سوچ رہا تھا۔ پین انگلیوں کے درمیان آگے پیچھے کی جانب حرکت کر رہا تھا۔ چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ ارسلان مسلسل افتخار کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تبھی اس نے زرینہ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ پیشانی پر فکر کی لکیریں نمایاں ہونے لگیں۔

"کاش میرا اس سے سامنا نہ ہو۔ کاش وہ میرے اضطراب میں افتخار کو نہ پڑھ لے۔"

وہ آنکھیں بند کیے اپنے اندر موجود افتخار کے راز کو زرینہ سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

زرینہ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

پل بھر کے لیے اس نے آنکھیں کھولیں۔ جانے کیوں آج وہ اسے افتخار کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ ہر وقت کچھ کیا جائے لازمی تو نہیں۔۔۔"

اس نے بظاہر نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"ھاھاھا، خوب کہا لڑکے! جب تم کچھ چھپا رہے ہوتے ہو بالکل اچھے نہیں لگتے۔"

"میری چوری پکڑی گئی۔"

زرمینہ کے لفظوں پر اس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"بھلے کچھ بھی ہو جائے افتخار کا راز میرے پاس اس کی امانت بن کر رہے گا۔"

اس نے پرعزم انداز میں مٹھیاں کھولیں۔اس کی طرف دیکھا اور خود کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔

"سنو لڑکی! ہر وقت کچھ چھپایا نہیں جاتا۔بعض اوقات انسان اپنی سوچوں میں خود کہیں چھپ رہا ہوتا ہے۔"

اس نے زرمینہ کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"زرمینہ کی نگاہیں گویا ہر راز کو پڑھ لیتی ہیں۔اس کی آنکھیں جیسے گہری جھیل سے بھی گہری بلکہ سات سمندر کی تہہ میں موجود راز کو بھی نکال کر حقیقت کے قریب لے آتی ہیں مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ تم خود سے نظریں نہیں ملا پا رہے۔لگ رہا ہے آج بہت کچھ سوچ رہے ہو۔"

زرمینہ نے حیران ارسلان کو اپنے آس پاس کھوئے دیکھا تو استفسار کیا۔

"ارے نہیں یار! میں سوچ رہا تھا کہ یونیورسٹی کے اختتام پر کیا کروں گا۔"

ارسلان نے نظریں پھیرتے جھوٹ بولا۔

"یہی کہ ڈھنگ سے جھوٹ بولنا سیکھو گے اور تاثرات چھپا سکو گے تو کسی پرائیویٹ فرم میں مارکیٹنگ یا ایچ آر میں لگ جاؤ گے۔"

زرمینہ نے بھی اسی انداز میں چوٹ کیا۔

"خیر تم سناؤ۔ارسلان سے لفظ نہیں جڑ رہے تھے۔بسا اوقات انسان باتیں کرنے کے لیے باتوں کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔وہ لفظوں کو ڈھونڈتا رہتا ہے مگر ایسے موقعوں پر الفاظ بھی زباں کا ساتھ دینے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آج اسے کیا ہو گیا ہے۔ایک پراعتماد لڑکا زرمینہ کے آگے ڈھے گیا ہے۔وہ

کچھ بول نہیں پا رہا۔ وہ افتخار کا وکیل بننا چاہتا تھا مگر وہ کیس شروع ہونے سے پہلے ہی کیس ہار رہا تھا۔

"رکو! میں چائے لے آتی ہوں۔"

زرینہ نے اس کی حالت دیکھتے اسے مختصر وقت دینے کا فیصلہ کیا۔

وہ جا رہی تھی۔ اونچے رستوں پر چلنے والی، اونچی اڑان اڑنے والی، خوابوں کے محل کی شہزادی، وہ لڑکی جو سب سے زیادہ خود پر بھروسہ کرتی تھی۔ جو محبت کو فریب کہتی تھی۔ وہ کیسے اس کی نگاہوں میں افتخار کی محبت کی شمع جلاتا۔ کیسے اس کے دل میں افتخار کی محبت کی کونپلوں کو پھوٹتا ہوا دیکھتا۔

"شاید سب سے مشکل کام محبت کرنا ہے اور اس سے بھی مشکل اس کو دوسرے دل میں بسانا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی مکان سے رہنے والوں کو بے دخل کر کے خود رہ لینا ہو۔ دل کے مکان میں پہلے سے کتنے لوگ رہتے ہیں۔ کتنے رشتے بستے ہیں۔ ان رشتوں کو دل کے خانوں سے نکال کر کسی مخصوص شخص کو سب سے خصوصی خانہ دینا بھی محبت کا ہی تحفہ ہے مگر اسی جذبے کو دوسرے شخص کے اندر پیدا کرنا شاید ناممکنات میں سے ایک ہے۔"

وہ خیالوں میں الجھا تھا تبھی زرینہ چائے لے کر آ گئی۔

"لو سقراط صبر کے ساتھ پی لو اور پھر سوچ لو تمھیں کیا کہنا ہے اور کیا سوچنا ہے کیوں کہ جو تمھیں سوچنا ہے تم سوچ تو رہے ہو مگر جو کہنا ہے وہ کہہ نہیں پا رہے۔"

زرینہ نے چائے کا کپ آگے بڑھاتے اس انداز میں کہا کہ ایک لمحے میں وہ گھبرا گیا۔ اسے لگا جیسے وہ سچ کہہ دے گا مگر اس کی دوستی بھی اتنی ہی مضبوط تھی کہ اس کے کمزور لہجے کو مضبوطی عطا کر سکتی تھی۔

"خوب کہی۔ آج کل تو سقراط گلیوں میں یوں نکل رہے ہیں جیسے برسات کے بعد مینڈک۔۔"

اس نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے کہا جب کہ دل لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"برسات میں مینڈک کیوں نکلتے ہیں جانتے ہو؟"

زرینہ نے اس کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ ان کے گھر پر کوئی اور قبضہ کر لیتا ہے۔ پانی ان کو زندگی دیتا ہے مگر یہی پانی ان کے گھروں کو کھا

جاتا ہے تبھی وہ اسی پانی کے ساتھ باہر نکل آتے ہیں۔جیسے۔۔۔"

وہ رک گئی۔

"جیسے؟"

اس نے الجھے انداز میں سوال کیا۔

"جیسے اس وقت تمھارے وجود پر کسی اور نے قبضہ کیا ہے اور وہی جذبہ اپنے تمام تر طاقتوں کے ساتھ تمھارے وجود سے عیاں ہو رہا ہے میرے مینڈک۔۔۔۔"

ارسلان کے سر پر پیار سے کتاب مارتے ہوئے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

"یہ لڑکی کتنی نظر شناس ہے۔اندر تک دیکھ لیتی ہے۔"

اس نے پل بھر کو سوچا اور دوبارہ گویا ہوا۔

"تو بی مینڈکی ہر بار افلاطون بننے کی کوشش مت کیا کریں۔ہر بار کیے گئے تجزیے درست نہیں ہوتے۔کبھی مینڈک اس لیے بھی باہر نکل آتا ہے کہ دیکھ سکے کہ باہر کی دنیا والے اندر کی دنیا والوں کو کہیں بھول تو نہیں بیٹھے۔"

اس کا جواب زرینہ کو بالکل متاثر نہیں کر سکا۔

"اچھا تمھارا مینڈک سیشن ختم ہوا ہو تو کام کی بات کر لیں۔"

زرینہ نے تنگ آ کر جواب دیا۔اسے یقین ہو گیا کہ ارسلان کچھ نہیں بتائے گا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" یہی تو تمھیں سمجھا رہا تھا۔

چائے ختم ہو چکی تھی۔پرندے ہواؤں میں اڑ رہے تھے۔لفظ گھوم رہے تھے۔جذبے احترام سے عقیدت کی چوکھٹ کو چوم رہے تھے۔محبت کا پودا درخت بن رہا تھا۔اسی کے ساتھ ہجر کا سایہ بھی گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے دونوں اشخاص دوستی نبھا رہے تھے۔ارسلان افتخار کی دوستی نبھا رہا تھا جب کہ زرینہ کوشش کر رہی تھی کہ اسے خاص ٹرانس سے باہر لا کر نارمل کرے۔

☆......☆......☆

رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح رات پھر اپنے اندر خوب صورتی لے کر آئی تھی۔ انسان بھی وقت کے ساتھ کسی قبر میں ڈھے جاتا ہے۔ ڈھلتا جسم، ڈھلتا وجود، صرف ایک شے مانگتے ہیں وہ خیال اور یادیں ہیں۔ اس وقت بوڑھے وجود کو چکاچوند دولت کی دیواریں متاثر نہیں کر سکتیں۔ اونچے پتھروں کے محل جہاں خاموش انسان مدفن ہوتے ہیں اس سے بہتر اسے وہ تھڑا لگتا ہے جہاں کوئی فقیر کہیں سے اکٹھا کیا گیا سالن پورے شوق کے ساتھ کھاتا ہے۔ تب اسے اونچے محلوں کی فکر نہیں ہوتی۔ اسے اونچے برجوں پر بیٹھے چھوٹے انسانوں کا رتبہ متاثر نہیں کرتا۔ یہی حال اس بوڑھے کا بھی ہوتا ہے جس کا سہارا صرف اچھی یادیں رہ جاتی ہیں۔

اندھیری رات کو چند تارے آسمان میں چمک بکھیرتے نظر آ رہے تھے۔ آج لان میں ایک اور شخص کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ارسلان بھی افتخار کا ہمنوا بن کر لان میں ٹہل رہا تھا۔

"افتخار مجھے نہیں لگتا کہ تمھاری محبت کامیاب ہو گی؟"

آخر کار ارسلان نے خاموشی توڑتے ہوئے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"یار جب محبت کی تب کوئی شرط رکھ کر نہیں کی تھی۔ محبت کی تھی جوا نہیں لگایا تھا۔ کوئی میچ نہیں کھیلا تھا کہ اپنی کامیابی کے یقین کیساتھ اس منزل کی جانب چلوں گا۔"

افتخار فضاؤں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

" مگر لاحاصل محبتوں میں انسان کو حاصل بھی تو کچھ نہیں ہوتا۔"

وہ اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھو دوست! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے وہاں محبت ہو گی جہاں حصول اور لاحاصل کے جھگڑے سوچنا اور سہنا ہوں گے۔ سوچ کر محبت کرتا تو اپنی برادری میں کرتا۔ وہیں کرتا جہاں بدلے میں بھی محبت مل سکتی تھی۔ جب تک محبت نہیں کرتا تھا تب تک بہت کچھ سوچتا تھا۔ جب محبت ہو گئی پھر سوچ بھی محبت کے تابع ہی چلنے لگی۔"

افتخار نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو تم کہہ رہے ہو کہ زرمینہ تمھارے وجود کا حصہ بن گئی ہے۔ یار اس دور میں بھی ایسی باتیں۔۔ سچ پوچھو تو

مجھے یقین نہیں آتا۔"

ارسلان نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ذہن میں زرینہ کے الفاظ گونج رہے تھے کہ اس ڈیجیٹل دور میں کس کو کس سے سچی محبت ہوسکتی ہے۔

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔ وہ تین سال سے میرے ساتھ تھی۔ میں جس دن اس سے نہ ملتا خود سے مل لیتا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ ایسی محبت وجود رکھتی ہے یا نہیں مگر میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ میرے ذات میں زرینہ کا وجود حقیقت بن چکا ہے۔ اسی کو سوچتا ہوں تو سکون ملتا ہے۔ خیالات کے اسی فی صد حصے پر اسی کا قبضہ ہے۔ ایسے لگتا ہے دماغ میں کہیں فلٹر لگ گیا ہے اس فلٹر کا نام زرینہ ہے۔ ہر خیال اسی فلٹر سے جیسے گزر کر آتا ہے۔ اسی کا رنگ روپ لے کر، اسی کا نام اوڑھ کر۔۔۔ میں کیا کروں ارسلان! میں بے بس ہو چکا ہوں۔ اس نے مجھے بس میں کر لیا ہے۔ میں تین سال سے خود سے لڑتا آیا ہوں۔ اس لڑائی میں نہ زرینہ ہاری ہے نا کوئی اور۔ میرے اندر وہ اور بھی مضبوط ہوئی ہے مگر میں ہار رہا ہوں۔ روز اندر بیٹھی زرینہ کو باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہوں تو افتخار ہی باہر ہو جاتا ہے۔ تم مجھے دلیلوں کے ذریعے چیزیں سمجھاتے ہو۔ میں دلیل کی منزل سے نکل چکا ہوں۔ دلیل وہاں دی جاتی ہے جہاں کوئی سنتا ہو۔ میری تو لڑائی اپنے اندر موجود زرینہ سے چل رہی ہے۔"

خلاؤں میں دیکھتے افتخار کی باتیں اسے کسی طرح نارمل انسان کی باتیں نہیں لگ رہی تھیں۔

"زرینہ اتنی بھی خاص نہیں ہے کہ اس کے لیے اتنا عام ہوا جائے۔ زرینہ اتنی بھی حسین نہیں تھی کہ تم اسے حسن کی آخری تفسیر سمجھ لو۔ اس شہر میں ہزاروں زرینائیں ہیں افتخار۔۔"

ارسلان کے بازو اس کے کاندھے پر تھے اور وہ الفاظ سے اس کے درد کو سہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"افتخار محبت کو وقت پر نہ روکا جائے تو ہجر کا سیلاب سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ بس مجھے اسی طوفان سے ڈر لگتا ہے جو تمھارے اندر اٹھ چکا ہے۔" ارسلان نے دوبارہ اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کتنی خاص ہے۔ میں کتنا عام ہوں۔ وہ کتنی حسین ہے میں کتنا نکما ہوں۔ بس ان سب میں سے میں کو نکال دو۔ بس وہی ہے۔ اس شہر کی ہزاروں لڑکیوں میں وہی ہے۔ ہزاروں چہروں میں سے اسی کا چہرہ حقیقت ہے۔ وہی میری محبت کی کتاب ہے ارسلان۔۔۔۔۔ وہ کتنی خاص ہے میرے وجود سے پوچھو۔"

افتخار کہہ رہا تھا جب کہ آنسو اس کی آنکھوں سے جاری تھے۔

"بس کرو افتخار۔۔۔ تم نے سوچا ہے کہ انکل آنٹی کو تم سے کتنی توقعات ہوں گی۔ تم یہاں زرمینہ کرنے نہیں مینجمنٹ پڑھنے آئے تھے۔ تم تو یہ بھی بھول گئے کہ سکالرشپ پر پڑھ رہے ہو۔"

ارسلان نے غصے سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"سکالرشپ، وہ ہنسا۔ میں مینجمنٹ پڑھ رہا تھا تبھی دل کا نظام بکھر گیا۔ میں نے کتابوں میں ڈھونڈا مگر کہیں بھی دل کی مینجمنٹ کو ٹھیک کرنے کا کوئی کلیہ درج نہیں تھا۔ کوئی قانون موجود نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں دل کو کسی مینجر کی طرح حکم دوں کہ بس بہت ہو گیا۔ جو وہاں ہے اسے فائر کر دو۔ نکال باہر کرو۔ جانتے ہو۔ وہ ہنسا۔ دل نے غور سے میرا حکم سنا اور مجھے ہی میرے وجود سے فائر کر دیا۔ اب میں باہر ہوتا ہوں اور وہ اندر رہتی ہے۔

افتخار پاگلوں کی طرح زرمینہ کی محبت میں جیسے پاگل ہو چکا تھا۔ وہ سب کچھ بھول رہا تھا۔ وہ تو یہ بھی بھول رہا تھا کہ وہ افتخار تھا۔ اپنے ماں باپ کا افتخار جس پر انہیں فخر تھا۔ وہ یونیورسٹی کا سب سے زیادہ پڑھنے والا لڑکا محبت کے سلیبس کو پڑھ بیٹھا تھا۔ اب اس کا دل کہاں کتابوں میں لگتا۔ وہ تو قصہ بننے جا رہا تھا۔ شاید کتابوں میں درج ایک نامعلوم قصہ۔۔۔۔۔۔

☆......☆......☆

آج موسم کافی سہانا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں ہر سو چل رہی تھیں۔ مہکے موسم میں انسان جلدی سے قدرتی نظاروں میں بہک جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے کوریڈور سے گزرتے ہوئے زرمینہ سوچ رہی تھی کہ ارسلان کو پچھلے چند دنوں سے کون سا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ کیوں وہ کنی کترا رہا ہے۔ کوریڈور کے دونوں اطراف کیاریوں میں لگے رنگ برنگے پھول یونیورسٹی کے حسن میں مزید اضافہ کرتے تھے۔ کبھی جب کوئی کلاس شام کے وقت ہوتی تب یونیورسٹی میں طالب علم کافی کم تعداد میں ہوتے تھے لہذا وہ آلتی پالتی مار کر کوریڈور کے کناروں پر ہی بیٹھ جاتے تھے۔ آج بھی ان کی ایک کلاس پانچ بجے رکھی گئی تھی۔ لہذا کوریڈور میں سرخ اینٹوں کے کنارے بیٹھے وہ اپنی سوچوں میں مگن تھی۔

تبھی اس نے ارسلان کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

وہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح لگ رہا تھا۔ارسلان کبھی جو اپنے قہقہوں سے آس پاس تازگی بکھیر دیتا تھا کملائے ہوئے پھول جیسا بکھرا بکھرا لگ رہا تھا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟"

بال پوائنٹ کو بلاوجہ نوٹ بک پر پھیرتے ہوئے اس نے خود سے سوال کیا؟

"کیا اسے میری کوئی بات بری لگی ہے۔؟"

پچھلے کئی دنوں سے افتخار بھی یونیورسٹی نہیں آرہا تھا۔ارسلان سے پوچھا تو طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔ یونیورسٹی میں موجود دوستوں کا سب سے مضبوط گروپ پانچ سال میں پہلی دفعہ کمزور نظر آرہا تھا۔

"کیا میری وجہ سے کچھ ہوا ہے۔"

اس نے خود سے سوال کیا اور اسی کے ساتھ نفی میں بھی سر ہلا دیا۔

"میری وجہ سے کچھ کیوں ہوگا۔میں تو ہمیشہ سب کے ساتھ اچھے طریقے سے چلتی ہوں۔پھر کیا ہوا ہے۔"

اس نے پھر سے الجھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"یہ ارسلان ایسا تو نہ تھا۔یہ تو منہ پر کہہ دیتا تھا۔پھر اتنے دنوں سے اس رویے کی وجہ سمجھ نہیں آرہی۔آخر مجھ سے ایسا کیا جرم ہوا ہے کہ یہ بے اتفاقی کے خندق میں روز اتارتا ہے۔"

اس کے چہرے پر شکن بڑھتی جا رہی تھی۔تبھی ارسلان اس کے بالکل قریب آگیا۔اس سے پہلے کہ وہ اسے نظرانداز کر کے آگے بڑھ جاتا۔اس نے ارسلان کو روک لیا۔

"ارسلان رکو۔"

اس کا رویہ خاصا جارحانہ تھا۔

"مجھے بتا ہی دو مسئلہ کہاں ہے اور یہ بھی بتا دو اس مسئلے میں، میں کہاں ہوں۔یقین کرو اگر مسئلہ میری وجہ سے ہے تو اسے حل بھی میں ہی کروں گی۔"

اس کا لہجہ عاجزانہ تھا۔

"کیوں بلاوجہ ہلکان ہوئے جا رہی ہو۔فی الحال تو سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

ارسلان نے پھر سے جھوٹ بولا۔

"نہیں ارسلان۔ کچھ تو ہوا ہے۔ کچھ تو ایسا ہوا ہے جس کی وجہ سے میں آگے پیچھے ہوگئی ہوں۔ افتخار کئی دن سے غائب ہے۔ تم سے پوچھوں تو طبیعت کی خرابی کا کہہ دیتے ہو۔ وہ تب بھی یونیورسٹی سے غیر حاضر نہ ہوا تھا جب 103 بخار ہوا تھا۔ تم کچھ بتاتے بھی نہیں مگر نظر انداز مسلسل کر رہے ہو۔"

اس نے شکوہ بھرے انداز میں کہا تو ارسلان تاسف میں ڈوب گیا۔

"افتخار کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"

ارسلان نے فوراً سے پہلے افتخار کا ذکر کرنا ضروری سمجھا۔

"یہ بہانہ کئی دفعہ سن چکی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ بات کچھ اور ہے۔ فرض کرو افتخار کی طبیعت خراب ہوئی ہے مگر تمھارے ساتھ کیا ہوا ہے۔۔۔۔"

وہ پھر گویا ہوئی۔

"میں ہٹا کٹا تمھارے سامنے کھڑا ہوں۔"

اس نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے جواب دیا۔

" کھڑے ہی تو نہیں ہو۔ زرینہ کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ارسلان تم کھڑے ہی تو نہیں ہو۔ جب تم دوستی میں کھڑے ہوتے تھے نا زرینہ اطمینان سے کسی بھی کونے میں بیٹھ جاتی تھی۔ مگر کئی دنوں سے تم صرف مجھے بے اطمینانی ہی دے رہے ہو۔"

اس کے لہجے سے شدید شکایت ظاہر ہو رہی تھی۔ جبکہ ارسلان بے بس تھا۔ ایک طرف دوستی تھی جب کہ دوسری طرف دوست تھا۔

"دیکھو زرینہ شک دوستی کو کھا جاتا ہے۔ تم کیوں شک کو پالتی ہو۔ شک پالو گی تو یہ پالتو جانور کی طرح دل میں مکمل گھر بنا لے گا۔ میری طرف سے تسلی رکھو۔ میں وہی ارسلان ہوں تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ اسی طرح دوستی میں کھڑا ہوں۔"

ارسلان نے خوشگوار انداز میں اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے چند جملے بولے جو شاید زرینہ کو

کبھی مطمئن نہیں کر سکتے تھے۔

"نہ تم دوستی میں کھڑے ہو نہ ہی کھرے ہو۔ شک تم پیدا کر رہے ہو۔ باتیں تم چھپا رہے ہو۔ اب اتنے جوگے ہو گئے ہو کہ چیزیں چھپانی آ گئی ہیں۔ مبارک ہو۔ تم نے یہ ہنر سیکھ لیا۔ میں کیسے شک نہ کروں جب میرے سب سے قریبی دوست قریب آ کر دور ہو رہے ہوں۔ جب روز انہیں باتیں کرنے کے لیے وجہ ڈھونڈنی پڑ رہی ہوں۔" زرینہ کی نوٹ بک کا سفید صفحہ کالی لائنوں سے بھر گیا تھا۔ ترچھی، عمودی لائنیں بے مقصد لائنیں۔۔ وہ بھی دوستی کی لائن میں بے مقصد خود کو گھومتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ افتخار کی گھومتی ہوئی محبت میں ارسلان اور زرینہ دونوں گھوم رہے تھے۔ شاید ایسی محبت جس کا کوئی کنارہ نہ ہو سب کناروں کو گھما دیتا ہے۔

ارسلان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے افتخار سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مر جائے گا لیکن زرینہ کو تب تک کچھ نہیں بتائے گا جب تک افتخار اجازت نہ دے۔

آئی ایم سوری۔۔ اگر تمھیں لگتا ہے کہ میں غلط ہوں تو مجھے معاف کر دو۔ ارسلان کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔ زرینہ کی آنکھوں سے چند آنسو سرخ اینٹوں میں جذب ہو گئے۔ یہ بھی دن آنے تھے ارسلان کہ کسی کا جھوٹ چھپاتے ہوئے تم اپنے ہاتھ معافی کے لیے بلند کر دو۔ تین سال سے وہ اسی کے ساتھ تھا لہٰذا اس کا ہر سچ جھوٹ وہ جان لیتی تھی۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ انہیں مزید مشکل میں نہیں ڈالے گی اور آزاد چھوڑ دے گی۔ شاید کسی مناسب وقت پر ارسلان سب کہہ دے اس نے یہی سوچ کر خود کو تسلی دی اور اس کے ساتھ کینٹین چائے پینے چلی گئی۔

☆......☆......☆

خوب صورت سے باغ سے مہکتے پھولوں کی خوشبو ہر طرف آتی محسوس ہو رہی تھی۔ پرندے درختوں پر چہچہا رہے تھے۔ مینا اور کوئل جیسے محبت کے سریلے گیت گا رہی تھیں۔ ان کی آواز سے جلتے دل بھی ساز عشق پر جھومتے من کی طرح جھوم رہے تھے۔

وہ تینوں شہر کے اس خوب صورت سے باغ میں سیر کے لیے آئے تھے۔ اگرچہ ان کے ساتھ باقی کلاس کے طالب علم بھی آئے تھے مگر وہ ہمیشہ اپنی ہی ٹولی بنا کر پھرتے تھے۔ یہ ان کا ایک تعلیمی تفریحی دورہ تھا اور ایسے

دورے مسلسل ہوتے رہتے تھے۔

وہ دونوں اس خوب صورت سے باغ کے سب سے خوب صورت حصے میں بیٹھے کائنات کی خوب صورتی کو اپنے اندر جذب کررہے تھے۔

تبھی ارسلان بول پڑا۔

زرینہ! یہ منظر کتنا خوب صورت اور خالص ہے نا۔ انسانوں کا دل بھی ایسے ہی خالص ہوتا ہوگا۔ سوچا کسی دن ایسا ہی خالص شخص تمھیں ملا۔

اس کی بات سن کر زرینہ مسکرانے لگی۔ جب کہ افتخار اس کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگا۔

ارسلان! مجھے نہیں لگتا کہ دنیا میں کوئی بھی شخص اس پھول کی طرح خالص ہوسکتا ہے۔ اس نے ایک پھول کو چھوتے ہوئے کہا جو اس کے قریب ہی اپنی دل فریب خوب صورتی بکھیر رہے تھے۔ دیکھو اس کی پتیوں کو، وہ دوبارہ گویا ہوئی، دیکھو ارسلان! اس کی ہر پتی اپنے اندر سچائی اور ایمان داری کی داستاں رکھتی ہے اور انسان ایسے کہاں ہوتے ہیں۔

اس کی بات سن کر افتخار بے اختیار بول اٹھا۔

اور زرینہ اگر کوئی پھول کی پتی بننا چاہے تو اس کا کیا معیار ہوگا۔

ھاھاھا! زرینہ اس کی بات پر ہنسنے لگی۔

اسے مرنا ہوگا۔ دونوں ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہے تھے۔ دیکھو اور کوئی طریقہ نہیں دیکھنے کا کہ دل میں کسی دیکھا جائے۔ لہٰذا دل میں رہنے والے کا باہر کیا کام۔۔۔ اس بس دل کی دنیا میں رہنا ہے۔ باہر کی دنیا میں نہیں۔۔۔

جانے افتخار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

زرینہ کیا تم سچ کہہ رہی ہو موت ہی محبت کے علم کی کسوٹی ہے؟ افتخار نے بھرائی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

ھاں افتخار! جو مرد ہاتھ بلند کر کے چاند تارے لانے کی بات کر سکتا ہے۔ جو محبت کو آسمانی افق پر چمکنے والا سب سے معتبر جذبہ گردانتا ہے۔ وہ ہمیشہ عورت کی وفا دیکھنے کے لیے اسے قربانی کی آگ میں پھینک دیتا ہے۔

میں چاہوں گی میں بھی اس کا امتحان اسی انداز میں لوں۔

زرمینہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا جب کہ ارسلان غور سے افتخار کو دیکھنے لگا۔

اور اگر وہ مر گیا۔

جانے کتنے دکھ سے کہے الفاظ تھے کہ ارسلان نے افتخار کے جملوں کا دکھ اپنی ذات میں محسوس کیا۔

چلو چھوڑو یہاں کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے ہم بھی۔۔۔ چلو کچھ اور بات کرتے ہیں۔

ارسلان نے موضوع بدلنے میں عافیت جانی۔ جب کہ افتخار چپکے سے وہاں سے اٹھ گیا۔

یہ کہاں گیا ہے۔ کچھ بتاتا ہی نہیں۔ خاموش جاتا ہے اور خاموشی سے واپس آتا ہے۔

زرمینہ کو افتخار کا یوں اٹھ کر جانا ہرگز اچھا نہیں لگا تھا۔ جب کہ ارسلان نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ افتخار نے مزید زرمینہ کے جملوں کے حملے سے خود کو بچالیا۔

وہ ان سے دور ایک چبوترہ نما جگہ پر آ گیا تھا۔

ہاتھوں کو فضاؤں میں بلند کیے، بند نگاہوں سے وہ سامنے سے چلتی ٹھنڈی ہواؤں سے مخاطب تھا۔

سنو نظارو! میں عشق ہوں۔ میں عشق کا راگ ہوں۔ مجھے سنو میں ہر ساز پر گایا جاتا ہوں۔ سنو دیکھو عشق کیا ہے۔ جانتے ہو عشق کیا ہے۔

عشق واحد، عشق زاہد، عشق عابد، عشق ناقد، عشق جامد، عشق نعمت، عشق زحمت ہے

عشق ذات ہے، عشق مات ہے، عشق رات ہے، عشق گھات ہے، عشق شاد ہے، عشق داد ہے۔

عشق اخلاص کا ہاتھ ہے، عشق جان دینے والا پھانسی کا گھاٹ ہے۔

عشق تعمیر کرتا ہے۔ عشق تعبیر دیتا ہے۔ عشق تحریر کرتا ہے۔ عشق ذات کے مینار پر دل کے ایوانوں میں وفا کی تقریر کرتا ہے۔ عشق محبوب کی گلی میں جنون کی آوازوں کی تشہیر کرتا ہے۔

سنو! عشق ذات کا درپن کھولے، عشق دل کا آنگن میں سوئے، عشق بس بے ہنگم بولے، عشق درد کا نغمہ ٹٹولے، عشق آگ کے لیے راہیں کھولے۔

سنو میں عشق ہوں۔ پتھر کی وادی میں موم کا شہر بنانے والا، میں نے بھی دل کی وادی میں عشق کا جہاں آباد

کیا ہے۔

وہ باغ سے متصل اونچی بلڈنگ پر چڑھ چکا تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہوائیں اس کے وجود کو چیرتی جا رہی تھیں۔

عشق میں جینے کے لیے مرنا پڑے گا افتخار!

زرینہ کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

افتخار، افتخار کتنی صدائیں اس کی جانب آ رہی تھیں۔

افتخار تم ہمارا افتخار ہو۔ لاکھوں آوازوں میں بھی اس نے یہ آواز پہچان لی۔ یہ اس کی ماں کی آواز تھی۔

افتخار! رکو افتخار۔۔۔ ایسا مت کرو۔ اس کا ضمیر اسے روک رہا تھا۔

وہ رونے لگا۔

عشق میں سولی پر نہ چڑھا تو کیا ذات کی تعبیر کی۔ جب روح جسم کے قید سے آزاد ہو جاتی ہے تب دل کا پرندہ بھی ہواؤں میں اونچی اڑانیں اڑنے لگتا ہے۔ تب عشق کی جنت میں وہ بھی محبوب کے ہمراہ گل و یاسمن کے باغوں میں اٹھلاتا پھرتا ہے۔

افتخار رک جاؤ۔ دیکھو ایک لڑکی کے لیے ایسا مت کرو۔ وہ ایک عام سی لڑکی ہے۔ اندر سے جیسے کسی نے پھر سرگوشی کی۔

عام سی لڑکی۔۔۔ اپنے من کی بات سن کر دکھ سے رو دیا۔

وہ عام سی لڑکی کتنی خاص بن چکی ہے تم اونچے چبوترے پر چڑھے افتخار سے پوچھو اس کا قد افتخار کی ذات میں چبوترے سے بھی بلند ہے۔

وہ ٹھاٹھیں مار کر رونے لگا۔ جب اسے ملنا کہنا افتخار نے تمہارا فخر بننے کے لیے خود کو مٹایا۔ تمہاری ذات کے ساتھ اس کا نام نہیں لگ سکتا تھا لہذا اس نے اپنی روح کے ساتھ تمہارے نام کو امر کر لیا۔

وہ کہہ رہی تھی نا کہ محبت میں ہر کوئی جی سکتا ہے۔ بات تب ہے جب کوئی مر کر دکھائے۔ اسے کہنا افتخار نے تمہاری بات کا مان رکھ لیا۔ وہ اب زندگی کو تمہارے حوالے کر کے تم سے ابدی تعلق رکھے گا۔

پاگل ہو گئے ہو کیا؟ پاگلوں جیسی باتیں مت کرو۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں۔۔۔۔ وجود میں جیسے جنگ جاری تھی۔

کچھ نہیں ! کچھ بھی نہیں! سنو میری ذات میں بیٹھے انسان اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میرے راستے اندھیروں کی طرف جاتے ہیں۔ زندگی مجھے طوفان نوح سی لگتی ہے میرے پاس اس سے نمٹنے کے لیے کشتی بھی نہیں۔ محبت کی سونامی نے میرے وجود کو تباہ کر دیا ہے۔

افتخار! دیکھو اس سے بات کرو۔ وہ مان جائے گی۔ تم ایسا مت کرو۔

وہ روٹھی کب تھی جو مانے گی۔ وہ میرا مان ہے۔ وہ میرا وقار ہے۔ وہ میری شان ہے۔ اس نے بس ایک چیز مانگی ہے۔ بھلا ایسی محبت کا کیا فائدہ جو اسے اس کی مانگ کے بدلے زندگی نہ دے سکے۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پورا وجود پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

ہوائیں اسی طرح اس کے وجود سے ٹکرا رہی تھیں۔ دفعتاً اس نے چھلانگ ماری۔ ایک زوردار چھلانگ۔ ایک چیخ ابھری۔ ایک انسان محبت کی سولی پر چڑھ گیا۔ ایک خوفناک چیخ نے محبت کو ہجر کی زمیں پر زندہ دفن کر دیا۔

افتخار! افتخار کتنی آوازیں بلند ہوئیں مگر شاید اس چیخ میں افتخار بھی کہیں گم ہو چکا تھا۔



محبت یوں بھی بدنام ہے کہ یہ جان لے کر جان چھوڑتی ہے۔محبت یوں بھی بدنام ہے کہ یہ ہستی کو مستی کے ساتھ خاک میں ملا دیتی ہے۔یہ بادلوں کے سنگ اڑ کر، کائنات کی ہر لمحہ سیر کر کے انسان کو زمیں پر پٹخ دیتی ہے۔

وہ چلانے لگا۔اسے ہر سو ماں کا افتخار بکھرا نظر آ رہا تھا۔

افتخار!افتخار ہوش کرو۔کیا ہوا۔جیسے کوئی مانوس آواز اس کے وجود پر محبت کے پھول برسا رہی تھی۔کوئی مانوس سا لہجہ جو اسے فرط وانبساط کی دنیا میں لے گیا۔جھٹکے سے اس کی آنکھیں کھلیں سامنے ارسلان پانی لیے کھڑا تھا۔

اوہ خدایا!اتنا برا خواب!یہ خواب تھا۔اس نے اپنے وجود کو ٹٹولا۔

پانی پیو افتخار!کیا نیند میں ڈر گئے۔

ارسلان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

نہیں محبت میں ڈر گیا ہوں ارسلان!اس نے دل میں اس سے کہا۔جب کہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ہاں ارسلان بہت برا خواب دیکھا۔بہت ہی برا۔۔۔۔اس نے ارسلان کو سینے سے لگا لیا اور کتنی دیر زارو قطار رونے لگا۔

بس کرو افتخار!برے خوابوں کا کفارہ ہی یہی ہوتا ہے کہ ان کا انجام اچھا ہوتا ہے۔مجھے نہیں پتہ تم نے کیا خواب دیکھا مگر تسلی رکھو کوئی خواب تمھیں خوف کی دنیا میں نہیں لے جا سکتا۔تم میرے سب سے بہادر دوست ہو۔

ارسلان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا جب کہ دل سے وہ خود بھی گھبرا گیا تھا۔

افتخار دن بدن عجیب حرکتیں کرتا آ رہا تھا۔آج یوں نیند میں کتنی دیر چلاتا رہا۔جانے زرینہ نے اسے کسی قابل نہیں چھوڑا۔

اسے زرینہ پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

میرے معصوم دل کے دل سے کھیلو گی نا تو زرینہ ساری زندگی محبت کھیل کی طرح تم سے چھپتی رہے گی۔

دیکھو کیا حال کر دیا اس کا۔اس کے افتخار کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے خود سے کہا۔

اس کا پورا جسم جیسے لرز رہا تھا۔خوف اس کے پورے وجود سے عیاں ہو رہا تھا۔ارسلان اسے ساتھ لے کر لان میں آیا۔دو گلاس ٹھنڈے پانی کے پلائے۔

کیا ہوا سکون ملا۔تھوڑی دیر بعد کرسی پر بیٹھے افتخار سے اس نے پوچھا جواب کافی پرسکون لگ رہا تھا۔

ھاں اب قدرے سکون ہے۔

تف ہے محبت پر،تف ہے عشق پر،تف ہے دل کی آباد دنیا جیسی باتوں پر۔۔۔۔کسی شخص کو اس حد تک بے سکون کر دینا کہ وہ اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو جائے،تف ہے ایسی محبت پر۔۔۔

ارسلان پہلی دفعہ محبت سے نفرت کر رہا تھا۔اسے پہلی دفعہ محبت کائنات کی سب سے بری شے لگ رہی تھی جس نے اس کے سب سے قابل دوست کو مقتول جیسا بنا دیا تھا۔

کافی دیر بعد جب وہ بالکل پرسکون ہو گیا تو وہ اسے لے کر کمرے میں آ گیا۔صبح کے پانچ بج رہے تھے۔وہ بیڈ پر شاید پرسکون نیند سو چکا تھا جب کہ اذیت کی لکیریں نیند میں بھی اس کے چہرے سے عیاں ہو رہی تھیں۔

ارسلان نے وقت دیکھا۔

واہ محبت،پورے دو گھنٹے بے سکون رکھا۔اسے بھی جس نے کی اور اسے بھی جو کرنے والے کا دوست تھا۔ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے سوچا اور اپنے بستر پر سونے چلا گیا۔

☆......☆......☆

دن اور رات یوں ہی گزر رہے تھے۔اگرچہ ارسلان نے زرمینہ سے تعلقات نارمل کر لیے تھے۔اب اسے کسی طور نہیں لگتا تھا کہ ارسلان اور افتخار کو کچھ ہوا ہے۔مڈ ٹرم کے کچھ دنوں بعد سمسٹر کے فائنل رکھ دئے گئے تھے۔اس کے بعد ان کے مزید دو سمسٹر باقی رہتے تھے۔وقت یوں ہی گزر رہا تھا۔وقت سب کے لیے ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔اس میں بس ایک خوبی ہوتی ہے کہ وہ بھلے اچھا ہو یا برا ہو گزر ہی جاتا ہے۔انہیں یونیورسٹی آئے تقریبا تین سال ہو رہے تھے۔تین سال اتنے کم بھی نہیں ہوتے کہ انسان ان لمحات میں موجود ہر لمحے کو اتنی آسانی سے بھول سکے۔مزید ایک سال ہی رہتا تھا جس میں طلبا نے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے قریب یا

کافی دور ہو سکیں۔ یونیورسٹی کی دیواریں ہر آنے اور جانے والوں کی داستانیں اپنے اندر محفوظ رکھتی ہیں۔ وہ تینوں پیپر کی تیاریوں میں جٹے ہوئے تھے۔

آج آخری پیپر تھا۔ سمسٹر کے اختتام پر کافی دنوں کے لیے چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ پیپر کے بعد تینوں کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اب اکثر خاموشی ہی ان کے درمیان گفتگو کرتی تھی۔

ہاں کیسے ہوئے تم دونوں کے پیپر؟

آخر زرینہ نے خاموشی توڑتے ہوئے دونوں سے سوال کیا۔

بہت اچھے ہوئے ہیں۔

ارسلان بولا جب کہ افتخار بس اسے تکے جا رہا تھا۔

تبھی ارسلان نے افتخار کی طرف دیکھا تو اسے زرینہ پر نگاہیں ٹکائے دیکھا۔

افتخار کے بھی پیپر بہت اچھے ہوئے ہیں۔

ارسلان نے افتخار کو کہنی مارتے ہوئے کہا تو وہ جیسے ہوش کی دنیا میں آ گیا۔

ہاں میرے بھی بہت اچھے ہوئے ہیں۔ اس نے ہونقوں کی طرح جواب دیا۔

طبیعت ٹھیک ہے نا افتخار۔

زرینہ نے بھی ان آنکھوں کی حدت محسوس کر لی تھی۔

الجھا رہتا ہوں سلجھے لوگوں کے سوالوں میں۔۔۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ابھی پچھلا درد آنکھوں سے محو نہ ہوا تھا۔ آنکھیں جیسے تھکے مسافر کی بند ہوتی آنکھوں جیسی لگ رہی تھیں۔

کس نے الجھا دیا سب سے سلجھے لڑکے کو؟

زرینہ نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔

چھوڑو زرینہ تم بھی کن باتوں میں الجھ رہی ہو۔

ارسلان نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

کیوں؟ کیا وہ میرا دوست نہیں۔ کیا میرا حق نہیں کہ جاننے کی کوشش کروں کہ اسے کون سا روگ لگا ہے؟

کیوں افتخار؟

اس نے کیوں افتخار اتنے پیار سے کہا کہ ایک لمحے افتخار کو لگنے لگا کہ وہ یہیں ڈھ جائے گا۔ کم بخت محبت میں دوسرے کا ایک لفظ ہی بری طرح مار دیتا ہے۔ وہ سوچنے لگا۔

زرینہ بس یہ سوچ لو وہاں زمین کھود لی ہے جہاں تہہ تک کہیں پانی کا نشان نہیں۔ اب اسی گڑھے میں خود گرتا جا رہا ہوں۔

زرینہ اسے کھوج رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر وہ کون سا راز ہے جو ارسلان اس سے چھپا رہا ہے۔ اتنا تو وہ جان ہی گئی تھی کہ وہ راز افتخار سے متعلق ہے۔

افتخار۔۔۔ بعض اوقات ہم مایوس ہو جاتے ہیں۔ پانی ہمارے قدموں کے نیچے ہوتا ہے۔ جہاں سے ہمیں امید باندھنی چاہیے ہم مایوسی کا چوغہ پہن کر زمین سے نکل آتے ہیں۔ حالانکہ صرف ایک وار ایک اور وار سے وہاں سے پانی نکل سکتا ہے۔ انسان ایسا ہی ہے۔ تم سچ بتاؤ کیا ہوا ہے۔ بتاؤ افتخار۔ زرینہ سے نہیں کہو گے۔

زرینہ نے آخری لائن اتنے نرم اور میٹھے لہجے میں کہی کہ ارسلان کو لگنے لگا افتخار کی جگہ وہ ہوتا تو شاید وہ بھی دل کھول کر اسے کے سامنے رکھ دیتا۔

تبھی ارسلان اٹھا۔

چلو افتخار! اس نے افتخار کو لے جانے میں ہی خیریت جانی۔

وہ ٹکٹکی باندھے زرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

کہاں؟

زرینہ اس آفت کے لیے قطعاً تیار نہیں تھی۔

مجھے فوراً گھر جانا ہے۔ امی کا میسج آیا ہے کہ فوراً پہنچو۔ ارسلان نے موبائل پکڑتے ہوئے جواب دیا۔

بھاگ رہے ہو؟

زرینہ نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔

کچھ ہوگا تو بھاگیں گے نا۔ تھکے ماندے لوگ کہاں بھاگ سکتے ہیں۔ ارسلان نے مختصر جواب دیا۔

افتخار چلو۔

افتخار جا چکا ہے۔ اسے لے جاؤ ارسلان۔ وہ جا چکا ہے۔ زرمینہ نے آنسوؤں میں ڈوبے افتخار کو دیکھا جو نہ جانے دل کی کتنی باتیں آنسوؤں سے کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ انہیں روکتی۔ ارسلان نے افتخار کو زبردستی ہاتھوں سے پکڑا اور کینٹین سے باہر آ گیا۔

کمرے میں پہنچنے کے بعد افتخار جیسے کرسی پر کسی مردہ لاش کی طرح بیٹھ گیا جب کہ ارسلان سر پکڑ کر اس کے سامنے آن بیٹھا۔

ارسلان یار! دیکھا تم نے۔ اس کے پاس ہنر ہے۔ وہ جان نکالنے کا ہنر جانتی ہے۔ وہ لفظوں سے جان نکال لیتی ہے۔ تم نے دیکھا نا۔

افتخار نے سپاٹ چہرے کے ساتھ دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مسٹر افتخار! وہ اب یہاں نہیں ہے۔ لہذا ہوش میں آ جاؤ۔

الیکٹرک کیٹل کے پاس جاتے ہوئے اس نے مختصر جواب دیا۔ اسے لگ رہا تھا افتخار کو چائے کے مگ کی اشد ضرورت ہے۔ شاید کیفین کچھ دیر اسے سکون پہنچا سکے۔

وہ یہاں نہیں ہے۔

افتخار اس کے جملے دہرا کر ہنسنے لگا۔

سنو سیدھے سادھے گاؤں کے بیوقوف لڑکے۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ یہ بات اپنے ذہن میں بٹھا لو۔ تم جن پہاڑوں سے آئے ہو نا وہیں لوٹ جاؤ۔ یا پھر جذبوں کو پہاڑ جتنا مضبوط کر لو۔

ارسلان نے غصے سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

حد ہو گئی ہے۔ کتنے عرصے سے سمجھا رہا ہوں۔ اس رشتے کا کوئی نام اور وجود ہی ممکن نہیں ہے۔ تمھاری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آتا۔ تمھارے درمیاں صرف دولت کا مسئلہ نہیں بلکہ فرقے کا مسئلہ بھی ہے۔ تم ان کے مخالف فرقے سے تعلق رکھتے ہو۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتے ہو۔ کیا تمھیں لگتا ہے کہ تم لوگ یہ فرق توڑ پاؤ

گے۔جانتے ہونا موجودہ دور میں سب سے مضبوط سچائی فرقے کی سچائی ہے۔یہاں کوئی بھی شخص مسلمان ہونے سے پہلے فرقہ پرست ہے اور تمھیں لگتا ہے کہ اس فرقے کی دیوار کو تم پار کرلو گے تو نرے احمق ہو۔اس کے گھر والے تمھیں ماردیں گے۔تمھاری لاش کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔ کتنے دنوں سے یہی بات سمجھانا چاہ رہا تھا۔تم سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے۔آج کھل کے بول پڑا ہوں۔اب آگے تمھاری مرضی۔

ارسلان نے اس کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے فریاد کی۔

مگر محبت کا کوئی فرقہ نہیں ہوتا ارسلان۔محبت کے فرقے ہوتے تو انسان آج کروڑوں فرقوں میں تقسیم ہوتا۔فرقے محبت کی وجہ سے تو پیدا نہیں ہوتے نا اور فرقے اگر نفرت ہی پھیلا رہے ہیں تو ہم ان کی آبیاری کیوں کرتے ہیں۔کیوں انہیں سینچ سینچ کر دل میں جگہ دیتے ہیں۔پھر کس منہ سے کہتے ہیں کہ مسلماں ایک ارب ہیں۔کیوں ہم فرقوں کا ریکارڈ سامنے نہیں لاتے۔تم مجھے بتا رہے ہو کہ محبت کروں گا تو فرقے کی جنگ میں مارا جاوں گا میں تمھیں سمجھا رہا ہوں کہ فرقے کی محبت ہمیں ویسے بھی ایک دوسرے سے اتنا دور لے آئی ہے کہ ہمارے پاس ایک دوسرے کے لیے فتووں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ہر شخص دوسرے کے لیے ایک عدد فتوی لیے کھڑا ہے۔کوئی کس طرح اٹھتا ہے۔کس طرح بیٹھتا ہے۔کیسے سوتا ہے۔کہاں جاتا ہے۔کیا پہنتا ہے۔سب فتوے کی ضد میں ہیں۔

افتخار کافی عرصے سے اس درد کو سینے میں رکھے ہوئے تھا لہذا آج پھٹ پڑا۔

افتخار تم سچ کہہ رہے ہو۔ہم سب مسلمان تھے مگر افسوس اب ہم فرقوں کی دوڑ میں بھاگنے والے چند افراد رہ گئے ہیں۔ہم اوہام زدہ لوگ،ہم دن رات صرف فرقہ فرقہ کرتے لوگ۔۔۔اب اس گدھ کی طرح ہو گئے ہیں جو مخالف فرقے کے مردوں کو بھی نوچ ڈالتا ہے۔پوری دنیا میں ہم تماشہ بن چکے ہیں۔کون سا ایسا لقب ہے جو ہمیں نہیں دیا گیا۔مگر تم سچ سے نہیں بھاگ سکتے۔تمھارے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے سچ بدل نہیں جائے گا۔سچ یہی ہے کہ یہاں فرقہ پرستی ہوتی ہے اور نا جانے کب تک ہوتی رہے گی۔تم،میں اور زرینہ جتنی مرضی کوششیں کرلیں ہم اس روایت کو بدل نہیں سکتے۔ ہوش کرو افتخار۔۔سچ کو تسلیم کرو۔

ارسلان نے چائے کا مگ اس کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔

ہوش تم کرو ارسلان ۔ بے ہوش تو ہم سب ہیں ۔ یہ بے ہوشی ہمیں موت کے منہ میں لے کر جائے گی ۔ ارسلان میں نے محبت انسان سے کی ہے ۔ فرقے کی دوڑ میں الجھے ہوئے پتنگ سے نہیں ۔ ایک جیتے جاگتے انسان سے جو ہماری طرح سانسیں لیتا ہے ۔ ہماری طرح سوچتا ہے ۔ جو معصوم ہے ۔ جس کے حواس خمسہ ہماری طرح کام کرتے ہیں ۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ مجھے فرقے کی آگ میں جلنا ہے تو شاید میں کبھی اسے رخ بھر کے بھی نہ دیکھتا ۔ محبت کب کس ذہن پر اترے گی ، کس نے سوچا ہے ۔ محبت کب فرقوں کی اوڑھنی اوڑھ کر آتی ہے ۔ محبت کب فرقہ پرستی پر مبنی فتووں کی چھت کو سراہتی ہے ۔ محبت بس دل میں نمو پاتی ہے ۔ وہیں پروان چڑھتی ہے ۔ اس کے اپنے رنگ ہیں ۔ اپنے ساز ہیں ۔ وہ اپنے پہناوے پہنتی ہے ۔ وہ دل کی ملکہ بن کر دل میں عزت کے ساتھ رہتی ہے ۔ محبت دیتی ہے ۔ محبت بانٹتی ہے ۔ محبت تقسیم نہیں کرتی ۔ محبت تقسیم کرنے والوں کو جمع کرتی ہے ۔ محبت نفی نہیں کرتی ۔ محبت نفی کرنے والوں کو مثبت بنا دیتی ہے ۔ محبت سے تم بے خبر ہو ارسلان ۔ محبت کی نفی تم کرر ہے ہو ۔ تم سمجا رہے ہو کہ محبت ایسے شخص سے کروں ۔ جس کا فرقہ ، زبان ، علاقہ ، بول چال ، معاشری درجہ بندی اور سب کچھ میرے جیسا ہی ہو ۔

ارسلان اسے غور سے دیکھتا جا رہا تھا ۔ وہ محبت میں کتنا سلجھ گیا تھا ۔ کچھ دن پہلے ارسلان ڈر گیا تھا کہ محبت اسے کہیں برباد نہ کر دے ۔ محبت تو اسے آباد کر رہی تھی ۔ اسے حساس بنا رہی تھی ۔ اس کے اندر انسانیت کی شمع جلا رہی تھی ۔

چائے پینے کے بعد افتخار نے ارسلان کو اڈے تک چھوڑا ۔ بس میں کتنی دیر دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے ۔ افتخار کشمیر کی ایک خوب صورت وادی میں رہتا تھا ۔ اس کے والد گورنمنٹ ملازم تھے ۔ اس کا معمول تھا کہ وہ سمسٹر ختم ہونے پر پہلے ارسلان کو گھر چھوڑتا تھا اور اگلے دن خریداری کر کے گھر کی طرف نکلتا تھا ۔ ارسلان بس میں بیٹھے سوچ رہا تھا محبت نے افتخار کو کتنا رعب عطا کر دیا ہے ۔ وہ کتنا جی دار ہو گیا ہے ۔ وہ کتنا صاف ہو گیا ہے ۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے درخت کے پتے بارش کے بعد دھل کر صاف ہو گئے ہوں ۔ وہ بھی اسے اسی طرح اجلا اور مہکا محسوس ہو رہا تھا ۔ محبت نے اسے مہکا دیا تھا ۔

☆......☆......☆

گھر پہنچنے پر اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ والدہ پھولوں کی پلیٹ ہاتھوں میں لیے اس پر پھولوں کا چھڑکاو کر رہی تھیں۔ اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔ کتنے دنوں بعد وہ گھر لوٹا تھا۔ اکلوتا بچہ جب جائے تب بھی آنسو دیتا ہے اور جب پلٹ آئے تب بھی ماں باپ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے ہیں۔ ماں اسے اکثر کہتی تھی کہ اس نے پیدا ہوتے ہی ان کی والد سے محبت بھی چھین لی تھی۔ ان کے پورے وجود کا نچوڑ تھا۔ ان کا پرتو تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ وہ اس کی سب سے بڑی کہانی ہے۔ وہ ان کو قدرت کی طرف سے ملنے والا سب سے بڑا انعام ہے۔ سب سے بڑی منزل وہی ہیا ور اس کی حفاظت انہوں نے ایسے ہی کی جیسے جنگل میں ہرنی شیروں اور بھیڑیوں سے بچا کر اپنے بچے کی حفاظت کرتی ہے۔

مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ محبت کرتی ہیں تو پورے وجود کے ساتھ کرتی ہیں۔ ماں اولاد سے ایک چیز ہی کر سکتی ہے وہ محبت ہے۔ مسز وقار کے ہاتھ خالی ہو چکے تھے پھول ہر طرف بکھرے ہوئے تھے جبکہ ارسلان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پھولوں کی سیج پر کھڑا ہے۔

پھولوں سے اچھی طرح آؤ بھگت سہنے کے بعد وہ ماں کے ساتھ کمرے میں آ چکا تھا۔ دونوں ماں بیٹے کتنی دیر محبت کی زبان میں گفتگو کرتے رہے۔ کتنی دیر وہ ماں کے سرہانے دوستوں اور یونیورسٹی کی باتیں کرتا رہا۔ زرینہ کی شرارتیں، افتخار کے چٹکلے اور ہاسٹل میں طلبا کی حرکتیں۔۔۔۔ وہ ماں سے اپنے بیتے لمحوں کو بیان کرتا رہا اور وہ ہر لمحے میں خود کو موجود پاتی تھیں۔ انہیں بھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہر اس لمحے میں سفر کر رہی ہیں جس کا ذکر ارسلان کر رہا ہوتا تھا۔

ماں سے باتیں کرتے کافی وقت بیت چکا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے میں آ چکا تھا۔ ملگجے اندھیروں نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا تھا۔ سورج کی روشنی جیسے روٹھ چکی تھی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں موجود کوئی کتاب پڑھ رہا تھا تبھی اس نے گاڑی کا ہارن سنا۔

بابا آ گئے۔ اس نے خوشی سے نہال ہوتے کہا۔ چھ مہینے بعد وہ ان سے مل رہا تھا۔ جلدی میں الٹی چپل پہن کر باہر نکل آیا۔

اوہ میرا شہزادہ آیا ہے۔

انہوں نے دور سے بانہیں پھیلا کر ہنستے ہوئے کہا تو وہ ان سے لپٹ گیا۔ جانے کتنے شکوے تھے۔ جانے کتنے خاموش شکوے۔

آپ کیسے ہیں بابا! اس نے بریف کیس پکڑتے ہوئے استفسار کیا۔

ارسلان جیسا جوان اور خوش ہوں۔ دیکھ لو۔ انہوں نے پیار سے اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا تو وہ جیسے جی اٹھا۔

کافی دیر سے گھر آتے ہیں۔ ماما تو آپ کا انتظار کرتی رہ جاتی ہیں۔ دروازوں کی کنڈیاں بھی چلا کر آپ کو بلاتی ہوں گی۔ میں نے سنا ہے اکثر آپ رات گئے واپس آتے ہیں۔

اس نے پیار سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

اور تو ماں کے لاڈلے۔ آتے ہی ماں نے باپ کی شکایت کر دی تم سے۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

ارے نہیں بابا! میں نے کافی دیر ماں کی جگہ خود کو رکھ کر دیکھا۔ ہر لمحہ میں آپ کی آہٹ کا انتظار کرتا رہا۔ اندھیری رات میں انسان اسے ڈھونڈتا ہے جو اس کے دل یا نگاہ کے سب سے قریب ہوتا ہے۔ تبھی سوچنے لگا ماں تو ایسا روز کرتی ہیں جانے ان پر کیا گزرتی ہوگی۔ اس کا جواب سن کر وہ مسکرا دیئے۔

یعنی ایک دن میں تم مسز وقار بن گئے۔ انہوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

بلکہ یہ کہئیے کہ ایک ماں کو دل میں محسوس کیا اور دل سے محسوس کیا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں ایک عورت بنا۔ عورت کے درد کو، ایک بیوی کے انتظار کو اور اس انتظار میں سلگتی آنکھوں کو محسوس کیا۔ دروازے کی چوکھٹ پر روز تکتی نگاہیں، ہاتھ بلند کرتے شوہر کے لوٹ آنے کی دعائیں کرتے ہاتھ، ایک عورت کو جو اکیلی بڑے سے گھر میں رہتی ہے اس کی تنہائی کو محسوس کیا۔ اس کرب کو، اس اذیت کو اس تنہائی کو اپنے اندر دل و جان سے محسوس کیا۔

لگتا ہے مینجمنٹ سے زیادہ ادب پڑھ رہے ہو بچے۔۔۔

انہوں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

بابا! ادب پڑھ کر ہی ادراک کے قریب ہوا ہوں۔ فہم کی سطح بلند ہوئی ہے۔ دکھ، اذیت، کرب اور غم کے معنی جان سکا ہوں۔ ادب نے ہی مجھے انسانوں کے قریب کیا ہے۔

وہ مسکرا دیئے۔ وہ یونہی ان کا دماغ کھپاتا رہتا کہ تبھی مسز وقار اسے ہاتھوں سے پکڑ کر اندر لے آئیں۔

تھوڑی دیر میں کھانا لگ گیا تھا۔ کھانے کی ٹیبل پر بھی اس کی گفتگو ہنوز جاری تھی۔ مختصر ترین کھانے کا سیشن دو گھنٹے پر محیط ہو گیا جس میں طویل چائے کا سیشن بھی شامل تھا۔ مسز وقار چونکہ اس کی عادت سے واقف تھیں لہذا وہ کھانا اور چائے دے کر اپنے کمرے میں چلی گئیں جو کہ قریب ہی تھا اور کمرے میں لیٹ کر مسکراتے ہوئے اپنے بیٹے کی باتیں سننے لگیں۔ جب کہ وہ ابھی بھی باپ سے مختلف امور پر بات کر رہا تھا۔

جب سیاست سے لے کر کرکٹ جیسے موضوعات کا اختتام ہوا تو اس نے نیا موضوع ادب چن لیا۔

آپ بس یہ بتائے آپ زبان کی زبوں حالی کے بارے کیا رائے رکھتے ہیں۔ خاص کر مفتوحین اور فاتحین کی زبان۔۔۔

اس کا اگلا سوال ادب کی زبوں حالی کے متعلق تھا۔

بیٹا! زبان کوئی بھی ہو خواہ فاتحین کی یا مفتوحین کی زبان کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے۔ فاتحیں کی زبان ہوتی ہے نا یہ دیر پا نہیں ہوتی۔ رومی کسی وقت دنیا پر حکمرانی کرتے تھے۔ کبھی یونانیوں کا سکہ بولتا تھا۔ مغلوں نے پورے ہندوستان میں حکومت کی مگر وہ زبانیں کہاں گئیں۔ زبان صرف وہی باقی رہتی ہے جو محبتیں بانٹتی ہے جو علم اور عقل تقسیم کرتی ہے۔ انگریزی کو ہی دیکھ لو۔ انگریزی صرف فاتحین کی زبان نہ رہی بلکہ علم، سائنس، ٹیکنالوجی سمیت ادب کی زبان بنی اسی لیے پوری دنیا پر آج بھی راج کر رہی ہے۔ رہی بات اردو کی تو یاد رکھو۔ اردو تب تک ہے جب تک اردو بولنے والے ہیں۔ جب تک اسے سمجھنے والے ہیں۔ اگرچہ اس کا معیار ویسا ہرگز نہیں ہے مگر یہ موجود ہے۔ دعا کرو کہ ہماری نفرتیں اس زبان کے ساتھ بھی ویسا سلوک نہ کریں جو انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے ساتھ کیا تھا کہ اسے بھی دو گز زمیں نہ ملے۔

وہ مزید سوال کر رہا تھا۔ اس کے سوالوں کی تعداد دیکھ کر وقار صاحب نے ارسلان کی ماں کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

ھاھاھا، مسز وقار آئے اور نئے ادیب کو لے جایئے۔ یہ تو ایک رات میں ہی ہی تفتیشی پولیس والے بن بیٹھیں لگتا ہے پورے چھ مہینے کا حساب لے کر جان چھوڑیں گے ساتھ لگتا ہے موصوف ادب میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ انہوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے مسز وقار کو آواز دی تو دور کمرے میں لیٹی ہوئی اس کی ماں مسکرا دیں۔

یہ سچ تھا کہ ارسلان کو ادب سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ ارسلان، افتخار اور زرینہ تینوں اردو ادب کے متوالے تھے۔ تینوں فارغ اوقات میں کلاسیک ادب سے لے کر پاپولر ادب تک پڑھتے تھے۔ وقار صاحب خود بھی ادب سے وابستہ تھے۔ کسی زمانے میں اپنے زمانے کے مشہور ادبی میگزین میں لکھا بھی کرتے تھے۔ ان کا ذوق اسے میراث میں ملا تھا۔ لہذا پورا گھرانا ہی ادب دوستی کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتا تھا۔

وقار صاحب اگرچہ اپنی بیگم سے حد سے زیادہ پیار کرتے تھے اور ان کا حد سے زیادہ خیال بھی رکھتے تھے۔ انہی کی خاطر گھر میں انہوں نے چھوٹا سا جم تک کھول لیا تھا جہاں ایک خاتون روز انہیں روزش کرواتی تھیں۔ وقار صاحب اگرچہ بہت سی اچھی خصوصیات کے حامل تھے مگر دو بری خصوصیتیں بھی ان میں پائی جاتی تھیں۔ ایک تو وہ غصے کے بہت تیز تھے اسی کے ساتھ جب وہ کوئی فیصلہ کرتے تو کسی کی نہیں سنتے تھے بھلے سامنے ان کی بیوی یا اولاد ہی کیوں کھڑی نہ ہو۔ نہ ہی کسی قسم کا مشورہ لینا گوارا کرتے تھے اور ان کا کوئی بھی فیصلہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا مگر اس کے باوجود تینوں محبت کے اٹوٹ انگ رشتے میں جڑے ہوئے تھے۔ رشتوں کی خوبصورتی یہی ہے کہ ایکدوسرے کو خامیوں اور خوبیوں دونوں کے ساتھ قبول کیا جائے اور خامیوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے نفرت اور خوبیوں کی وجہ سے حد سے زیادہ محبت کا نظریہ نہ اپنایا جائے۔

کھانا کھانے کے بعد دونوں باپ بیٹا لان میں ٹہل رہے تھے۔ وہ جب بھی گھر آتا تھا ماں یا بابا دونوں میں سے ایک کے ساتھ رات کے کھانے کے بعد لان میں لازمی ٹہلتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر لمحہ انہی کے ساتھ گزارے جن کے ساتھ ہر لمحہ خوب صورت گزرتا ہے۔ وہ ہر لمحے میں انہیں جیتا تھا۔ انہیں محسوس کرتا تھا۔ وہ چند دنوں کے لیے آتا تھا اور انہیں پوری زندگی دے جاتا تھا۔

بابا! ادب تو ہم بے ادبوں کو حد میں رکھتی ہے۔ یہ ادب نہ ہو تو جانے ہم کتنی سرحدیں پھلانگ جائیں۔

ویسے بھی ہماری زبان زوال پذیر ہے۔اس نے ٹہلتے ٹہلتے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔اب بھی جیسے ادب ہی اس کا موضوع تھا۔

بیٹا! کوئی زبان زوال کا شکار نہیں ہوتی۔لوگ زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔زبان ہمارے رحم و کرم پر رہتی ہے۔زبان سانسیں نہیں لیتی مگر ہماری سانسیں اسے آکسیجن دیتی ہے۔جب ہم اپنی زبان چھوڑ کر دوسری زبان کو گھر میں بساتے ہیں تب زبان بھی کسی روٹھے ہوئے محبوب کی طرح گھر سے رخصت ہو جاتی ہے۔جیسے سوکن ہوتی ہے نا اپنی زبان پر کسی دوسری سوکن کو لے کر آؤ گے تو زبان بھی پہلی بیوی کی طرح روٹھ کر میکے چلی جائے گی۔لہٰذا اس میں زبان کا کوئی قصور نہیں۔

انہوں نے اسے دلچسپی سے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیا۔

مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اردو کا کوئی مستقبل ہے۔اردو مستقبل کی زبان بن سکے گی؟

ھاھاھا لگتا ہے موصوف اردو زبان پر تحقیق کر رہے ہیں۔سچ بتاؤ مینجمنٹ ہی پڑھ رہے ہو نا کہیں اردو ادب میں داخلہ تو نہیں لے لیا۔انہوں نے اسے تنگ کرتے ہوئے کہا۔

نہیں بابا! ایک آپ ہی ہیں جس سے یہ دکھ بیان کرتا ہوں۔آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ زبان کے مرنے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ایک وقت تھا جب آپ قلمی نام سے ادب کی خوب خدمت کرتے تھے۔آج آپ ہمارا لکھا بھی خوشی سے پڑھ لیتے ہیں اور روتی آنکھوں سے اسے بھی ادب قرار دیتے ہیں۔

بابا! اس سے بڑھ کر اور دکھ کی کیا بات ہو گی کہ ایک شخص جس نے ادب سے پہلی سچی محبت کی ہو آج قلم توڑ کر صرف کاروبار کر رہا ہو اور اس کی سچی محبت لوگوں کے غرضوں میں کہیں کھو گئی ہو اور اس نے ادب سے سارے رشتے ختم کر دیے ہوں۔

دکھ کی ایک گہری لکیر انہیں اپنے وجود میں محسوس ہوئی۔اس کی باتیں جیسے ہتھوڑے کی طرح ان پر برس رہی تھیں۔ادب، ادب سے محبت کسی زمانے میں ان کے لیے گالی بن چکی تھی۔ادب کی راہ میں سب کھو کر ہی انہوں نے اس راہ کو چھوڑا تھا۔

☆......☆......☆

وقار صاحب کے ذہن میں مسلسل ارسلان کی باتیں گونج رہی تھیں۔ مسز وقار جانے کتنی دیر پہلے سو چکی تھیں۔ وہ ٹہلتے ہوئے چھوٹی سی لائبریری میں داخل ہوئے۔ میز پر موجود لیمپ کو روشن کیا اور اسی کے ساتھ موجود کرسی سے ٹیک لگا لیا۔ کتنے رسالے، اب وہ اس بات سے بھی ناآشنا ہو چکے تھے کہ کتنی کتابیں ان کی لائبریری میں موجود تھیں۔ کتنے عرصے بعد انہوں نے اس کمرے کا رخ کیا تھا۔ اگرچہ مسز وقار باقاعدگی سے کمرے کی صفائی کرواتی تھیں مگر پھر بھی کہیں کہیں کتابوں پر مٹی لگی رہ جاتی تھی۔

تبھی انہوں نے سگار سلگایا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں۔

کتنی آوازیں ان کے ذہن میں گونجنے لگیں۔

"آپ کی کہانی معیاری نہیں"

"آپ کسی اور رسالے میں بھیج دیں"

یہ ابتدائی جملے تھے جو انہوں نے نوجوانی میں ایک رسالے کے ایڈیٹر سے سنے تھے۔ ان کی ابتدائی چھ تحاریر ناقابل اشاعت قرار دی گئی تھیں مگر لکھنے کا جنون ان کے سر سوار تھا۔ لہٰذا ایک وقت ایسا بھی آیا جب انہیں قابل اشاعت کے الفاظ بھی سننے کو ملے۔ پھر ایک وقت آیا جب ایڈیٹر بن کر وہ دوسروں کی تحاریر کے ساتھ وہی سلوک کر رہے تھے جو ان کی تحاریر کے ساتھ ہو رہا تھا۔

دفعتاً ان کی آنکھیں کھلیں۔ لمبی سی آہ بھری۔ انہیں نے لمبا سا کش لیا اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ افسانہ کم، مزاحیہ کہانی زیادہ لگ رہی ہے۔"

"آپ کا افسانہ بے حد عمدہ ہے"

"آپ کا افسانہ شائع کر کے ہمیں دل سے خوشی ہو گی"

فون کی گھنٹی بجنے پر ان کے جوابات اور بسا اوقات تحریر کے شائع نہ ہونے پر مختصرا خط کی صورت بھیجا جانے والا جواب انہیں یاد آنے لگا۔

"آپ کا رسالہ ایک غیر معیاری رسالہ ہے"

"دیکھئے میں فلاں کا بھتیجا ہوں۔ میری تحریر لازمی چھپنی چاہیئے"

"مجھے آپ کے رسالے سے نفرت ہے"

"آپ کے معیار پر کوئی پورا اتر سکا ہے"

ہونہہ معیار نہ ہوا۔ گویا آپ کے رسالے میں لکھنے کے لیے ہمیں معیار کے آسمان کو چھونا ہوگا"

انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ وہ زیر لب مسکرانے لگے۔ وہ پھر سے ماضی کے دریچوں میں جا پہنچے تھے۔ ماضی جہاں وہ موجود تھے۔ جہاں ایک لکھاری، ایک ادیب موجود تھا۔

وقار صاحب ایک زمانے میں ایک ادبی رسالے کے مدیر بھی رہ چکے تھے۔ ایم اے اردو کرنے کے بعد انہوں نے مختلف اخباروں اور ادبی رسالوں میں بطور انچارج ادبی صفحہ اور ایڈیٹر کام کیا۔ ان دنوں ان کا واحد ذریعہ معاش بھی ادب ہی تھا۔ ادب ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ وہ خود بھی لکھتے تھے اور قلمی نام سے لکھتے تھے۔ ان کے لکھے کو سراہا بھی جاتا تھا اور ان کی تحریروں کو مختلف ادبی رسالوں میں خصوصی جگہ دی جاتی تھی۔

ایک وقت تھا جب ادب کی خدمت انہوں نے دل سے کی تھی۔ ادب کو دل میں بسا کر رکھتے تھے۔ معیار پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ اسی چیز نے انہیں برباد کر دیا۔ جب ایک مشہور اخبار سے ناطہ توڑ کر انہوں نے بطور ایڈیٹر ایک مشہور ادبی رسالے کی بھاگ دوڑ سنبھالی تو معیار بھی سخت کر دیا۔ مگر ان کا رسالہ وہ شہرت حاصل نہ کر سکا جو دوسرے رسالے حاصل کر رہے تھے۔ حد سے زیادہ سخت معیار کی وجہ سے جلد ہی انہیں ادارے کے مالک نے تنبیہ کی کہ یا تو وہ میگزین کی سرکولیشن بڑھائیں یا پھر معیار گھٹائیں۔ وہ دونوں کام نہیں کر سکے لہذا ایک دوپہر انہیں بڑی عزت کے ساتھ رخصت کر دیا گیا اور نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ انہیں کسی بھی ادارے نے ملازمت کے بعد جلد از جلد فارغ کر دینا جیسے بنیادی اصول بنا لیا۔ بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ معیار پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ اپنا رسالہ نکالنے کے لیے ان کے پاس مناسب وسائل نہیں تھے۔ وہ شدید مایوس ہو گئے۔ یہاں تک کہ کھانے کے لالے پڑ گئے۔ مسز وقار نے ایسے حالات میں بھی ان کا دل و جان سے ساتھ دیا۔ وہ ہر موڑ پر انہیں تسلی دیتی تھیں۔ ان کی ڈھارس باندھتی تھیں۔ بالآخر تنگ آ کر ایک دن قریبی رشتے دار سے قرضہ لے کر چھوٹی سی کپڑوں کی دوکان کھولی۔ قسمت ان پر مہربان تھی لہذا دوکان چل پڑی۔ ترقی کرتے کرتے انہوں نے کئی دوکانیں بنا لیں۔ جلد ہی انہوں نے ایک پارٹنر کے ساتھ مل کر دوسرا کاروبار شروع کیا جس میں

انہیں حد سے زیادہ کامیابی ملی۔اس وقت وہ اپر مڈل کلاس میں شمار ہوتے تھے۔اس دن کے بعد سے انہوں نے ادب سے ہر قسم کا رشتہ توڑ لیا۔ انہوں نے ہر قسم کی ادبی سرگرمیاں ختم کر دیں یہاں تک کہ ہر اس شخص سے رابطہ توڑ لیا جس نے قلم سے رشتہ جوڑا تھا۔کتنے سال ہو گئے انہوں نے ایک بھی تحریر نہیں لکھی۔یہاں تک کہ اکثر اپنا دکھ بھی صرف اپنے آپ کو سناتے تھے۔سگار کتنی دیر سے جل رہا تھا۔ان کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔چہرے پر کرختگی چھائی ہوئی تھی۔ماضی انہیں اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

صبح خاصی خوشگوار تھی۔سرمئی بادل ہر سو چھائے ہوئے تھے۔ناشتہ سب کے ساتھ کرنے کے بعد وہ گھر سے باہر نکل آیا۔اسلام آباد کی سڑکوں پر فضول مٹرگشت کرنے لگا۔وہ بائیک پر کبھی اس راستے اور کبھی اس راستے پھر رہا تھا۔تھوڑی دیر بعد وہ جناح سپر مارکیٹ پہنچ گیا۔پسند کی چند شرٹیں اور پرفیوم خریدنے کے بعد وہ مشہور پلاؤ والے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے چلا گیا۔وہ جب بھی اسلام آباد آتا یہاں کے پلاؤ لازمی کھاتا۔اسلام آباد میں اگرچہ اس کے بہت سے دوست تھے لیکن اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ اکیلا ہی گھومے۔وہ کھلی فضاؤں کو دل سے محسوس کرنا چاہتا تھا۔لمبی چوڑی سڑکوں پر بائیک چلاتے اور لہراتے بالوں کے ساتھ کھلی فضا کو دل سے محسوس کرتے وہ اپنے آپ کو کسی فلم کا کردار سمجھ رہا تھا۔کافی وقت گزار کر گھر آیا تو ماں کو موجود نہیں پایا۔کافی دیر انتظار کے بعد وہ گھر آئیں مگر ارسلان کو محسوس ہوا کہ وہ خاصی ناراض تھیں۔

سنا ہے تم نے کھانے سے انکار کیا ہے۔انہوں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

جی میں نے کھا لیا تھا۔

ماں نے اس کے جواب کا شدید برا منایا۔

" کتنے دنوں کے بعد ماں کے پاس آئے ہو مگر ایسا لگتا ہے تم لاہور سے ابھی پہنچے ہی نہیں ہو۔بیٹا لاہور سے نکلے تھے تو دل وہیں چھوڑ کر تو نہیں آئے تھے کیوں کہ ارسلان تو پہنچ گیا ہے میرا بیٹا ابھی تک نہیں پہنچ سکا۔"

ان کی باتیں سن کر اسے محسوس ہوا کہ واقعی اس سے غلطی ہوئی ہے۔شاید اس کے ذہن میں ابھی تک ہاسٹل بس رہا تھا۔

"بہت معذرت ماما! واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے محسوس ہی نہیں ہوا کہ میں آپ کے پاس آگیا ہوں۔ دراصل آپ اتنی پیاری ہیں کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ آپ موجود ہیں یا نہیں ہیں۔ ہر لمحہ ایسا لگتا ہے جیسے آپ ساتھ ہیں۔ یقین کریں کھانا کھاتے وقت میں نے کولڈ ڈرنگ بھی دو بوتلیں منگوائیں تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا آپ میرے ساتھ کھانا کھا رہی ہیں۔" اس نے ماں کو منانے کی کوششیں کرتے ہوئے کہا۔

"جھوٹے۔۔ آوارہ گردی کرتے کہاں ماں یاد آتی ہوگی۔ انہوں نے بھرپور شکایت کی۔

نہیں ایک عدد وسیع دل کے مالک ارسلان کی ماں! آپ کا بیٹا آپ کو نہیں بھولا۔ اس دل کی بھلا اتنی جرات کہ وہ آپ کو بھول جائے۔ آپ میرا پہلا عشق ہیں۔ اس نے انہیں مسکا لگاتے ہوئے کہا۔

ویسے جھوٹ بولنا کوئی تم سے سیکھے ارسلان صاحب۔ تمھیں یونیورسٹی میں کیا جھوٹ سکھایا جاتا ہے۔

وہ پیار سے بولیں تو وہ مسکرا دیا۔

اے مادر گرامی! دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی دل کی یونیورسٹی ہے جس کا براہ راست تعلق زبان سے ہے۔ وہ دل جب بھی آپ کو دیکھتا ہے تو زبان سے کہتا ہے۔ اے نالائق جلدی سے اچھے الفاظ بول دے۔ تبھی زبان فوراً سے پہلے جذبوں کا اظہار کر جاتے ہیں۔

توبہ کتنا باتونی ہے یہ لڑکا۔ اس کے جملوں پر مسکراتے ہوئے وہ بے اختیار دل میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوئیں۔

ویسے تھوڑی دیر پہلے آپ گئی کہاں تھیں۔ پورے گھر میں آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

"ماں کہاں جا سکتی ہے۔ تمھارے بابا ہوتے ہیں تو ان کی راہ تکتی ہوں۔ تم آتے ہو تو تمھیں تکتی ہوں۔ ماں کو کام تم دونوں کا تکنا ہی رہ گیا ہے۔ دونوں باپ بیٹا ایک جیسے ہو۔ وہ وقت پر گھر نہیں آتے۔ تم گھر آتے ہو مگر تمھارے پاس وقت نہیں ہوتا"

"وعدہ کرتا ہوں اب آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

اس نے ہاتھ باندھتے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو انہوں نے پیار سے اسے گلے لگا لیا۔

"وعدہ کرو رات کا کھانا ماں کے ساتھ کھاؤ گے۔ پھر بہانہ نہیں کرو گے" انہوں نے وعدہ لیتے ہوئے کہا۔

"وعدہ والدہ گرامی، والدہ۔۔۔۔اب ایسی غلطی بھی نہیں ہوگی۔کھانا کیا اب ناشتہ اور چائے بھی آپ کے ساتھ پیوں گا" اس نے انہیں خوش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔جاؤ معاف کیا مگر اس معافی میں یہ شرط ہے کہ تم ماں کو ماں کے پاس ہی رکھ کر جاؤ گے یوں ریسٹورنٹ میں بوتلوں کے بیچ رسوا نہیں کرو گے" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو ارسلان نے زوردار قہقہہ لگا دیا۔

ماں اور اولاد کی محبت بھی عجیب ہوتی ہے۔اولاد اگرچہ اس محبت میں بدل جاتے ہیں مگر جو چیز پتھر کی طرح اپنی جگہ قائم رہتی ہے وہ والدین کی محبت ہے۔مسز وقار کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ اپنے منہ کے لقمے بھی اولاد کے منہ میں دے دیتیں۔انہیں یہی قلق رہتا تھا کہ ارسلان کم کھاتا ہے۔دنیا کے سب والدین کو یہی لگتا ہے کہ ان کی اولاد کم کھاتی ہے۔محبت کی سب سی میٹھی قسم والدین کی محبت ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

راتیں بھاری ہو جاتی ہیں۔دل اندھے ہو جاتے ہیں۔جذبے اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔

اے خالق کن فیکون!اے دلوں کے بھید سے آگاہ راز آشنا!میں تیرا اک گنہگار بندہ ہوں۔جذبوں کی توقیر لفظوں کی تشہیر کے ذریعے برقرار رکھتا ہوں۔نکھرتا تب ہوں جب عشق کی خوشبو ذات کو نکھارتی ہے۔تبھی ہنستا ہوں جب جذبوں کی دیوی دل کے پربت پر میرے من کو گدگداتی ہے۔اسی کا عکس میری آنکھوں میں رقص بن کے دوڑتا ہے۔وہ روح میں بسی ہوئی خوشبو ہے۔وہ دل میں چھپی جستجو ہے۔وہ تاریک راتوں کو تنہائی کی چادر اوڑھ کر مجھ سے کی جانے والی گفتگو ہے۔تو دیکھ رہا ہے نا اور تجھ سے بڑھ کر کون دیکھ سکا ہے۔تو سن رہا ہے نا بے شک تجھ سے بہتر سامع کون ہے۔میں اس کی ذات میں ڈھل رہا ہوں۔وہ میری ذات میں ڈوبتے سورج کی کرنوں کی طرح ڈوب گئی ہے۔ایسا لگتا ہے میرا دل مغرب ہو گیا ہو جہاں اس کی محبت کا سورج غروب ہوتا ہو۔مجھے قرار عطا کر۔کبھی اپنی ذات سے بھی شرمندی ہوتی کہ جائے نماز پر تجھ سے کیا شے مانگتا رہتا ہوں۔کیا کہتا رہتا ہوں؟مگر تیرے سوا کس سے کہوں۔کس کے پاس جاؤں۔اندھیری رات کو تو دل میں امید کی کرن بن کر آتا ہے۔تیرے ہونے کا احساس ہوتا ہے تو سارے احساس جاگ جاتے ہیں۔جب محسوس کرتا ہوں تو ہر سو ہے تو دل کے قریب تجھے محسوس کرتا ہوں۔تجھے رازداں سمجھ کر دل کا درد بیاں کرتا ہوں۔بے شک تجھ سے زیادہ قریب

کون ہے۔ میرے دل کے آشنا، میرے رازوں کی حفاظت کرنے والے، میرے وجود کو سکون کی نیند سے مزین کرنے والے، میری صبح کو امید کا استعارہ عطا کرنے والے مجھے سکون عطا کر۔۔۔۔

راتیں یوں ہی میرے لیے وحشت ناک بن جاتی ہیں اور میرے رگ وپے میں درد واذیت کی لہر بن کر اترتی ہیں۔ میں بکھرتا ہوں۔ میں گر جاتا ہوں۔ اے کلیم سے کلام کرنے والے، اے خلیل سے دوستی نبھانے والے، میرے رگ وپے، میرے وجود کے ہر مرض سے تو آگاہ ہے۔

وہ جائے نماز پر کتنی دیر فریاد کر رہا تھا۔ آنسو اس کے وجود سے گر کر جائے نماز پر جذب ہو رہے تھے۔ اس کا وجود کپکپا رہا تھا۔ ہاتھ لرز رہے تھے۔ ہونٹوں سے الفاظ آنسوؤں کے قطروں میں مل کر باہر نکل رہے تھے۔ رات کی تنہائی ہر سو چھائی ہوئی تھی مگر وہ سب سے بے نیاز، بے نیاز ترین ہستی کے سامنے سربسجود تھا۔

☆......☆......☆

دن کے بارہ ہو چکے تھے۔ ساری رات جاگتا رہا تھا نا جانے کب نیند آئی تھی اور کتنی شدت کی نیند آئی تھی کہ گھوڑے بیچ کر سو گیا تھا۔ بابا کہتے تھے جوانی کی نیند اور اڑیل گھوڑے کو سنبھالنا سب سے مشکل کام ہے۔ دونوں بے قابو ہوتے ہیں اور بے قابو کر دیتے ہیں۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ ماں کے روم کی جانب بڑھا مگر وہ وہاں نہیں تھیں۔

"ماما! وہ پورے گھر میں چلانے لگا۔"

"وہ باہر گئی ہیں۔" ایک نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک قدرے دبلی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"آپ کون؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ اپنے ہی گھر میں یوں کسی اجنبی لڑکی کو دیکھ کر اسے خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔

"جی آپ کو انکل نے بتایا نہیں۔" اسے نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں کچھ بتانا تھا کیا انہیں" اس نے جواب دیا۔

"آپ انہی سے دریافت کر لیجئے گا؟" معصومیت سے جواب دیا گیا۔

" کیا آپ کوئی راز ہیں جسے دریافت کرنا پڑے گا۔" اس نے شگفتگی سے جواب دیا۔

" نہیں ایک عام سی لڑکی ہوں۔کوئی راز نہیں ہوں۔گھبرائیے مت آپ کو دریافت کرنا نہیں پڑے گا"

اس کا جواب سن کر وہ مزید الجھ گیا۔

عجیب بات ہے۔میرے گھر میں مجھے کوئی اجنبی سیڑھیوں کے سامنے کھڑا ملتا ہے۔اس سے پوچھتا ہوں تو کہتا ہے اسے دریافت کروں۔کیا آپ کوئی سیارہ ہیں۔کوئی ایسی چیز جو ابھی زمین سے نکلی ہیں۔

اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

میں بس میں ہی ہوں۔انتہائی کمزور آواز میں جواب دیا گیا۔

اس طرح تو دو "میں" ہو گئے۔ایک اور آپ اور دوسری؟

جی۔۔۔

اس نے ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔آنکھوں میں جیسے ڈر موجود تھا۔

دوسری میں کون ہیں؟

پتہ نہیں۔۔۔؟

مختصر جواب دیا گیا۔

اُف۔پہلے ہی گھر میں دو لوگ ہیں۔کم ہی بولتے ہیں۔اب ایک تیسری آ گئی۔کیوں نہ اس گھر کا نام کم گو ہاؤس رکھ لیں۔اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

آپ کا گھر ہے آپ کی مرضی۔

اس کے جواب سے ارسلان پھر چڑ گیا۔

تو میرے گھر میں جو اجنبی موجود ہے اس سے پوچھ رہا ہوں کچھ۔؟

کیا پوچھ رہے ہیں؟

اس نے ہونقوں کی طرح سوال کیا تو ارسلان کا دل کرنے لگا کہ کسی چیز سے اپنا سر پھوڑ لے۔

میڈم آپ کو اردو آتی ہے یا وہ بھی دریافت کرنا پڑے گا۔

اب کے خاصے تند لہجے میں اس نے سوال کیا۔

جی آتی ہے۔

بس تین الفاظ بول کر نظریں پھر جھک گئیں۔

ارسلان کافی حد تک تنگ آ گیا تھا۔عجیب سی لڑکی تھی جو کچھ بول ہی نہیں رہی تھی۔

ارسلان کی عادت تھی کہ قدرے خاموش اور اپنی دنیا میں مگن لوگوں کو جان بوجھ کر چھیڑا کرتا تھا۔مگر آج وہ خاصا جھنجھلا گیا تھا۔

لگتا ہے آپ بہت ہی خاص لڑکی ہیں۔کہیں ماما نے کوئی گڑیا تو نہیں رکھ لی جو بول ہی نہیں سکتی ہو۔

اس نے اب عاجز آتے ہوئے کہا۔

میں بس اک عام لڑکی ہوں۔بس عام سی۔۔۔

ارسلان نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا تو وہ کپکپا رہے تھے۔دفعتاً وہ غصہ بھول گیا۔اسے اس لڑکی پر خاصا رحم آنے لگا۔

ویسے عام سی لڑکی کیا ہوتا ہے اور خاص لڑکی کی تعریف کیا ہے۔

اس نے اب اسے باقاعدہ تنگ کرنے کی ٹھان لی تھی۔

عام یعنی میری جیسی، خاص یعنی آپ جیسے۔۔اس کا جواب سن کر ارسلان بے اختیار ہنس پڑا۔

میرے جیسا۔یعنی آپ کو ماما نے نہیں بتایا کہ میں لڑکا ہوں۔میری جیسی خاص لڑکی، حد ہے۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ جھینپ گئی۔

میرا مطلب ہے۔۔۔وہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھ رہی تھیں۔چہرہ جیسے زرد ہو رہا تھا۔الفاظ زبان سے باہر نہیں نکل رہے تھے۔

ارسلان اس کے چہرے پر موجود گھبراہٹ کو واضح محسوس کر رہا تھا۔لہٰذا اس نے بالآخر اس کی جان چھوڑتے ہوئے ناشتے کی ٹیبل کا رخ کیا۔

☆......☆......☆

وہ کتنی دیر شیشے کے سامنے خود کو دیکھ رہی تھی۔ ارسلان گھر سے جا چکا تھا۔

میرا نام نیہا احمد ہے۔ تعلیم ایم اے انگلش ہے۔ وہ شیشے میں دیکھ کر خود سے کہنے لگی۔

اس کے سامنے تو بزدل بن گئی تھی۔ اچانک شیشے میں سے کسی نے سوال کیا۔

وہ میرا کچھ لگتا نہیں تو بہادر کیوں بنوں۔ اس نے شیشے میں موجود سراپے کو جواب دیا۔

لیکن وہ دیو نہیں تھا جو تم ڈر گئیں۔ پھر سے آواز آئی۔

دیو، اس نے شیشے میں دیکھا۔ دیو تو وہ حالات ہیں۔ دیو تو وہ رشتے دار ہیں جن سے میں بھاگتی آ گئی ہوں۔

میں اس لیے بھی نہیں بولی کہ کہیں الفاظ میرا مان نہ توڑ ڈالیں۔

رنجیدہ چہرے سے اس نے اپنے سراپے سے کہا۔

نیہا احمد! تم ہمیشہ بھاگتی آئی ہو۔ ہر ایک سے بھاگتی آئی ہو۔ مگر کب تک۔۔۔۔ ہر شخص تمہیں برا ہی لگتا ہے۔ آخر کیوں؟

اسے لگا جیسے آج اس کا سراپا پھر سے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے۔

ہاں میں بھاگ رہی ہوں۔ مگر کس سے۔ سگے رشتوں سے۔ اپنے رشتوں سے۔ خون کے رشتوں سے۔ مقدس رشتوں سے۔ جب مقدس رشتے مقدس نہیں رہے تو سرِ راہ ملنے والے اجنبی کیسے اپنے ہو سکتے ہیں۔

اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

تم نے اسے کیوں نہیں بتایا تم نیہا احمد ہو۔ دکھ سہنے والی لڑکی۔ روز مرنے والی لڑکی۔

آواز پھر اسے اذیت کی دنیا میں لے کر جا رہی تھیں۔ وہ رو رہی تھی۔ دفعتاً وہ چلائی۔

سنو ارسلان۔۔۔ میرا نام نیہا احمد ہے۔ وہ شیشے میں مخاطب ہوئی۔

ارسلان صاحب میرے بابا اور انکل بہت اچھے دوست تھے۔ ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی۔ ابو نے دوسری شادی کر لی۔ میں نے سوتیلے پن کا دکھ سہا ہے۔ اللہ نے دوسری ماں کی کوکھ ہمیشہ کے لیے بانجھ کر دی تھی۔ شاید ان کو کرموں کی سزا اسی صورت ملی تھی۔ میرے چچا بابا کی جائیداد کی وجہ سے ان کے جانی دشمن بن گئے ہیں۔ کئی

قاتلانہ حملے کر چکے ہیں مگر اللہ نے انہیں ہمیشہ محفوظ رکھا ہے۔ چونکہ میں بھی آپ کی طرح اکلوتی اولاد ہوں لہذا اب وہ بری طرح میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ کہتے ہیں یا زمین دو یا لڑکی دو۔ انہیں لگتا ہے دونوں صورتوں میں زمین انہیں ہی ملے گی۔ بابا نے انکل سے درخواست کی کہ کچھ دنوں کے لیے مجھے کہیں چھپا دیں شاید تب تک وہ مجھے باہر بھیجنے کے لیے کچھ انتظامات کر سکیں گے۔ یہی میری کہانی ہے۔ یہی جاننا چاہتے تھے۔ جان لو۔ میں ایک بدنصیب لڑکی ہوں۔" اس کا دامن آنسوؤں سے بھر چکا تھا۔ کافی دیر رونے کے بعد اس نے خود کو خاموش کروایا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔

اسے شروع سے عادت تھی کہ اپنے دکھوں کا اظہار شیشے میں موجود نیہا سے کر دیتی تھی۔ وہ اکثر شیشے میں خود سے مل لیتی تھی۔ دکھ بیان ہو جاتے تھے اور دل مطمئن ہو جاتا تھا۔

تبھی اس نے ارسلان کی آواز سنی۔ وہ باہر نکلی تو ارسلان کو سامنے کھڑے پایا۔

ماما نہیں آئیں؟ ارسلان نے سوال کیا۔

نہیں۔ اس سے مختصر جواب ملا۔

آنکھیں جھکائے لفظوں میں دکھ کا اظہار کرتی لڑکی اس لمحے اسے کتنی پاک لگی۔ کتنی معصوم سی تھی وہ۔ اگرچہ اس کی شکل واجبی سی لگ رہی تھی مگر معصومیت بے انتہا درجے کی تھی۔

"اچھا ان سب میں آپ یہ بتانا بھول گئیں کہ آپ کا نام کیا ہے اور خدانخواستہ کوئی ایسا نام تو نہیں جسے لیا جائے تو کچھ ہو جائے گا" اس کے دلچسپ استفسار پر جیسے وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

جی میرا نام نیہا احمد ہے۔ آپ کے لیے چائے بنا دوں کیا؟

جھکی نظروں نے پھر سے سوال کیا۔

یعنی چند گھنٹوں میں آپ کچن آشنا ہو چکی ہیں۔

ارسلان کی بات کا اس پر قطعی اثر نہ ہوا۔

جی میں صبح سات بجے یہاں پہنچی تھی۔ ایک گھنٹے میں آنٹی اور میں شناسا ہو گئے پھر انہوں نے کچن دکھایا۔ شاید انہیں کہیں جانا تھا مگر میری وجہ سے نہیں جا رہی تھیں۔ تبھی میں نے انہیں بھیج دیا۔ آپ کے بارے خصوصی

کہہ کر گئی تھی۔آپ کہیں تو چائے بنادوں۔

جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں اس نے گویا پوری داستان ہی سنادی۔

چائے کے ساتھ پکوڑے بھی بنادیں۔

ارسلان نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

جی بہتر۔۔۔

وہ خاموشی سے کچن کی طرف جانے لگی تبھی ارسلان نے اسے روک لیا۔

آپ مذاق بھی نہیں سمجھتیں کیا؟

نیہا نے مڑکر اسے دیکھا۔ ہنستے چہرے والا، وجیہ صورت ارسلان، جسے شاید دل رکھنا آتا تھا مگر وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس کا دل بچپن میں ہی سوکن ماں کی گود میں جل گیا۔شاید ارسلان کو دل رکھنا آتا ہو مگر اس کے پاس وہ دل ہی نہیں جسے وہ رکھ سکتا تھا۔

وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگی۔

نیہا احمد کو ارسلان کے سوالوں سے الجھن ہونے لگی تھی۔ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کٹہرے میں کھڑی ہو کر کسی کو صفائیاں پیش کر رہی ہے۔

صرف چائے بنادیں۔چینی لازمی ملائے گا۔میں خاموش چائے نہیں پیتا۔

اسے ارسلان کا طنز واضح محسوس ہوا۔

مگر وہ ہمیشہ سے چپ ہی رہتی آئی تھی۔آج کیسے بول سکتی تھی۔

میں ابھی لاتی ہوں۔

ویسے ماما کب تک آئیں گی بتا کر نہیں گئیں کیا؟

ارسلان نے پھر سے اسے روک لیا۔

نیہا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے وہ ارسلان سے جلدی سے جان چھڑائے۔اسے لوگوں سے وحشت ہوتی تھی۔وہ تنہائی پسند تھی۔اسے اپنی تنہائی میں کسی کی مداخلت پسند نہ تھی۔

آنٹی کہہ کر گئی ہیں وہ دو بجے تک آئیں گی؟ اب میں جاؤں یا کچھ اور پوچھنا ہے آپ نے۔

اس کے انداز نے ارسلان کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

جی شکریہ۔۔۔ آج تو ماما سے لڑائی پکی ہے پھر۔۔ اس کی آواز نے پھر سے اسے چونکا دیا۔

کیسی لڑائی؟ نا چاہتے ہوئے بھی اس نے پوچھ لیا۔

رات کو ہی انہوں نے ممتا اور بیٹے کے فرائض اور حقوق پر مجھے اتنا بڑا لیکچر دیا تھا۔ آج صبح ہی بیٹے کو چھوڑ کر باہر چلی گئیں۔

اس نے ہاتھ گھما کر کچھ ایسے انداز میں کہا کہ نیہا اندر ہی اندر مسکرا اٹھی۔ آنٹی نے سچ کہا تھا یہ لڑکا باتونی ہے۔ یہ دل رکھنا جانتا ہے۔ کتنے عرصے بعد وہ مسکرائی تھی۔ اسے یہ گھر اپنے گھر سے کتنا مختلف لگا تھا۔ یہاں کے لوگ کتنے سچے تھے۔ اس نے دل میں سوچا۔ بابا کے پاس اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ سوکن ماں نے کبھی اسے بیٹی ہی نہیں سمجھا تھا بلکہ کچھ رشتے دار یہ بھی کہتے تھے کہ سوکن ماں اس کے چچاؤں کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ دکھ کی کتنی گرہیں تھیں جو اسے باندھ کر رکھتی تھیں۔ نیہا نے سوچا اور چائے بنانے کے لیے چلی گئی۔

☆......☆......☆

زرینہ زرینہ۔۔۔ اٹھ جاؤ لڑکی۔ تم کون سا پہاڑ سر کر کے آگئی ہو جو نیند ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ دروازے پر ڈانٹ کے ساتھ مسلسل دستک ہو رہی تھی۔

توبہ ہے امی! سونے بھی نہیں دیتیں۔ اس نے آنکھیں کھول کر اردگرد دیکھا۔ کمرا ابھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

یا اللہ! کہیں آدھی رات کو تو نہیں اٹھا دیا۔ کچھ نہ سمجھ آنے والے انداز میں اردگرد دیکھتے ہوئے اس نے کہا اور بیڈ کے سائیڈ پر پڑے موبائل فون کو اٹھا کر آن کیا۔

سکرین پر دو بجے کا وقت نمودار ہو رہا تھا۔ اردگرد سناٹا چھایا ہوا تھا۔ روشنی دبیز پردوں کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔

اوہ خدایا! دو بجے تک سوئی رہی ہوں کیا میں؟ امی صحیح کہتی ہیں۔ فل نکمی ہوں میں۔

وہ خود کو کوستے ہوئے بیڈ سے اٹھی۔ پردے ہٹائے اور واش روم میں برش کرنے چلی گئی۔

یونیورسٹی سے آئے ہوئے تین دن ہو چکے تھے جبکہ ابھی کافی چھٹیاں باقی تھیں۔ اس بار سمسٹر بریک ایک مہینے کی ہو رہی تھی۔

وہ جب بھی گھر آتی تھی زیادہ تر وقت سو کر ہی گزارتی تھی پھر بھی اسے لگتا تھا کہ اس کی نیند پوری نہیں ہوتی۔

تیار ہو کر ڈائننگ ہال میں پہنچی تو ماں شدید غصے میں بپھری بیٹھی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ آج خوب اسے خوب سارا سننا پڑے گا۔

پرنسز! تشریف لے آئیں۔ بہت جلدی آ گئیں۔ ابھی وقت ہی کیا ہوا ہے؟

انہوں نے غصے سے ہنکارتے ہوئے کہا۔

امی مجھے کسی نے جگایا کیوں نہیں۔ جلدی جگا دیتیں تو اٹھ جاتی۔ ان کے بدلے ہوئے تیور کو دیکھتے ہوئے اس نے ڈر کر سوال کیا؟ اسے علم تھا کہ اگر وہ اپنی مرضی کا کچھ بھی کہے گی تو کھری کھری سننی پڑ جائے گی۔

وہ پھر سے مخاطب ہوئیں۔

آپ کسی کے اٹھانے سے کہاں اٹھنے والی ہیں۔ محترمہ ملازمہ دس دفعہ آپ کے دروازے پر دستک دے چکیں مگر مجال ہے جو آپ ٹس سے مس ہوں۔ آخر ساری رات کونسے محاذ فتح کرتی رہتی ہیں آپ جو دن کو جاگنے میں اتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

بہت معذرت چاہتی ہوں۔ رات دیر سے سوئی تھی۔ اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا تو وہ مزید چڑ گئیں۔

ساری رات کیا کرتی رہی تھیں۔ ناسا میں کہیں ایک رات میں سیٹلائیٹ تو نہیں بھیج دیا یا کہیں میری مہارانی نے کوئی نیا سیارہ دریافت کر لیا ہو۔ آخر کونسا کارنامہ سرانجام دیتی رہیں جو فخر سے بتا رہی ہیں کہ ساری رات جاگتی رہی۔ آج کل کی لڑکیاں تو سب کچھ بھول بیٹھی ہیں۔ پہلے لڑکے جاگتے تھے اب تفریق ہی ختم گئی۔ دونوں صنفیں رات بھر جاگتی ہیں۔ اسے کوئی سینڈروم ہی سمجھو۔ یہ نئی نسل مجھے کسی طور نارمل نہیں لگتی۔ غضب خدا کا رات بنی کس لیے ہے۔ سونے کے لیے یا جاگنے کے لیے۔۔۔ اور جاگ کر کرتے کیا ہو۔؟

اسے اندازہ ہو چکا تھا اب امی شروع ہو چکی ہیں لہذا بس ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لہذا وہ کرسی کے سامنے تھوڑی پر بازو ٹکائے ان کی طرف چہرہ کیے انہیں سنتی رہی۔

ماما! کتنے دنوں سے خاموش تھیں آپ۔۔لگتا ہے کافی دن بعد میری ماں کو تقریر کا موقع ملا ہے۔

اس نے ماں کو مزید چھیڑتے ہوئے کہا۔

ہاں میری لاڈو۔گھر ایک سٹیج ہے اور میں مقررہ۔۔یہاں بس ایک سامع ہے وہ میری بیٹی ہے۔اسے سننے کا شوق نہیں۔جب سے آئی ہے یا سوتی ہے یا موبائل میں کھوئی ہوتی ہے۔ماں اور باپ بھی کہیں موجود ہیں یا نہیں۔لگتا ہے آپ نے ہمیں اپنی ذات سے نفی کر دیا ہے۔تین دن سے اپنی بیٹی کو گھر میں ڈھونڈ رہی ہوں۔گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کا فاصلہ طے کرنے میں اور ایک ماں کو بیٹی سے ملنے میں تین دن لگے ہیں۔آئندہ بتا دیا کرو تا کہ ایک ہفتہ پہلے آپ سے ملنے کی تیاری پکڑ لوں۔

ماں کے لفظوں میں چھپے دکھ کو اس نے واضح طور پر محسوس کیا۔وہ غلط تھی۔وہ سمجھ پا رہی تھی کہ وہ غلط تھی۔ماں سے تین دن پہلے گھر آ کر ملی تھی اس دن کے بعد وہ کمرے میں ہی رہتی تھی۔کھانا،ناشتہ،کھانا اور چائے کمرے میں منگوا رہی تھی۔ایسے میں ان کا غصہ بالکل بجا تھا۔

ماما! میری پیاری ماما! یقین کریں آپ کی یہ ڈانٹ سننے کے لیے ہی دیر سے اٹھی ہوں۔جلدی اٹھتی تو کہاں میری ماں مجھے ڈانٹتی۔مجھے معاف کر دیں۔غلطی ہوئی۔ اس نے پیار سے ماں کی بانہوں میں بازو حمائل کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دیں۔ایک پل میں بھول گئیں کہ وہ بیٹی سے ناراض تھیں۔

مسز وقاص ایک سلجھی ہوئی اور نکھرے خیالات کی حامل خاتون تھیں۔انہیں شروع سے دولت کی چکا چوند متاثر نہ کر سکی تھی۔وہ محبتیں بانٹتی تھیں۔جذبوں کی تجارت کر کے محبت خریدتی تھیں۔وہ دلوں میں بسنا خوب جانتی تھیں۔وہ مشرقی روایات کی دلدادہ تھیں۔امارت نے ان کے ماتھے پر ذرا بھر بھی شکن پیدا نہیں کی تھی۔وہ آج بھی سادہ لباس میں ملازموں کے ہمراہ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتی تھیں۔وہ کسی تفریق کی قائل نہ تھیں جب کہ وقاص صاحب شروع سے تمام خصوصیات میں ان کے برعکس تھے۔انہیں غریب اچھے نہیں لگتے تھے۔وہ اگرچہ مشرقی روایات کو برائے نام ہی اہمیت دیتے تھے مگر وہ مذہبی خیالات میں کافی انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔وہ ان

لوگوں میں سے تھے جو مذہب سے زیادہ فرقے پر عمل کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مسز وقاص نے زرینہ کی تربیت میں اپنا اچھا خاصا کردار ادا کیا تھا۔ زرینہ زیادہ تر ان کا پرتو تھی۔ اس میں ان کے کردار کی جھلک نظر آتی تھی۔ اگرچہ امارت اور دیگر چیزوں میں اس نے باپ کا اثر ہی قبول کیا تھا۔

☆......☆......☆

افتخار جب گھر کی طرف جا رہا تھا تو خاصا بجھا ہوا لگ رہا تھا۔ اونچے نیچے، ہموار اور تیکھے راستوں سے ہوتے ہوئے جب وہ گھر پہنچا تو اس سے پہلے امید کی کرن گھر پہنچ گئی تھی۔ اس کے آنے کی امید پہلے سے ہی گھر میں موجود کمزور ماں کو طاقت دے رہی تھی۔ جب چھوٹے سے موبائل سکرین پر بیٹے کا "شام تک پہنچ رہا ہوں" کا پیغام ماں نے پڑھا تو کچھ دیر کے لیے وہیل چیئر کو راستے سے ہٹا دیا۔

"میرا بیٹا آ رہا ہے۔"

وہ جیسے کشمیر کی وادیوں میں موجود ہر شے کو اعلان کر کے بتا رہی تھی۔

گھر کے سامنے ہی شہتوت کا کھلتا ہوا درخت پورے جوبن کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔ گرمیوں کے دنوں جب وہ گھر آتا تو شہتوت آسمان سے اتری پریوں کی طرح چھن سے اس کے لیے بھیجی ہوئی چھوٹی سی رکاب میں اکٹھے ہو جاتے۔ ہر دانہ دوسرے سے نکھرا ہوا ہوتا۔ کالے رنگ کے دمکتے ہوئے شہتوت جن میں موجود حلاوت اور مٹھاس اس کی تھکن کو لمحوں میں اتار دیتی۔

مگر ماں پہلی بار دیکھ رہی تھی کہ شہتوت کی اوٹ میں چھپا ہوا لڑکا افتخار ہرگز نہیں تھا۔ کوئی بوڑھی روح صدیوں کا بوجھ کندھے پر ڈھائے گھر پہنچی تھی۔ جس کی چہچہاتی آواز سے گھر میں چہچہاتے پرندوں کا سا گمان ہوتا تھا مگر گھر کے ہر فرد کی آنکھ کے تارے کو پہلی دفعہ صرف آنکھ سے آنسو گراتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ کہیں دور کسی پتھر کی سلیب پر بیٹھ کر کسی چشمے کے کنارے کتنی دیر وہ اپنی ذات سے اٹھ نہیں پاتا تھا۔

افتخار!

شام کو وہ گھر پہنچا تو ماں نے کراہتے ہوئے کہا۔

جی ماں جی! کیا ہوا؟ اتنا مختصر جواب شاید اس نے زندگی میں نہیں دیا تھا۔

کچھ ہوا ہے کیا؟ سچ بتا دے کیا ہوا ہے۔ ورنہ میرے دل کو کچھ ہو جائے گا۔

ماں نے لرزتے ہونٹوں سے سوال کیا تو افتخار لاجواب اسی انداز میں کھڑا ہو گیا۔

ماں جی کچھ ہونا لازمی نہیں۔ کبھی کچھ ہوئے بغیر بھی سب کچھ ہو جاتا ہے۔

اس کی دلیلیں ماں کی عقل میں نہ سمائیں۔

دیکھ بیٹا، تیری طرح پڑھی لکھی نہیں لیکن اتنا جان گئی ہوں کہ تو راستے میں کہیں اتر گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے شاید آدھے راستے کا فاصلہ طے کیا ہے تو نے۔۔۔ آدھا یہاں آ کر طے کر رہا ہے۔ بیٹا کس راستے کا ہمنوا بنا ہے۔

انہوں نے چمکتی پیشانی پر ابھرے پریشانی کے آثار کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

نہیں ماں جی! جب رستے نظر سے اتر جائیں تو انسان رستوں سے خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ وہ ماں کے قریب ہوا۔ ان کے دونوں ہاتھوں کو پیار سے تھاما اور محبت کا بوسہ دیا۔

ماں! تیرا بیٹا! رستوں میں اترتے اترتے دل سے بھی اتر گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ماں کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ گویا ہوئیں۔

بیٹا! تو ہمارا افتخار ہے۔ ہمارا فخر، اور فخر رونے لگے تو ماں باپ ٹوٹنے لگتے ہیں۔ میری جان، میں نے تجھے افتخار بنا کر بھیجا تھا۔ تم کب سے اتنے بے اختیار ہو گئے۔

انہوں نے روتے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو وہ مزید پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

چھوٹے سے خوبصورت کمرے میں ماں کے ساتھ اس کا حوصلہ رہتا تھا۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے اس کے آنسو صاف کیئے۔ ماتھے پر بوسہ دیا۔

افتخار! وہ پھر سے بولیں۔

سن بیٹا! کچے گھڑے میں کبھی پرانا پانی مت ڈالنا۔ تمہارا ذہن بھی ابھی کچا ہے اس میں پرانی اشیاء اور نظریئے مت گھسا دینا۔ پہلے ذہن کو پکا ہونے دے۔

اپنے تئیں وہ جانے کیا سمجھ رہی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ان کا بیٹا محبت میں ہارے شخص کی طرح

ان کے سامنے روتا نظر آئے گا۔

ماں یہ فرقہ سب سے اہم ہوتا ہے کیا؟

اس کے سوال سے وہ فوراً سٹپٹا گئیں۔

کیا کسی نے تمھیں چھیڑا یا تمھیں چھیڑنے کے لیے فرقے کو چھیڑا۔

بس آپ بتایئے۔؟ شاید وہ بھی اب پرسکون ہو چکا تھا۔

بیٹا سب سے اہم تو انسان ہوتا ہے۔ اللہ نے بھی پہلے ہمیں انسان ہی بنایا تھا۔ مٹی سے گوندھ کر۔۔۔۔اس نے تو ایسا انسان بنایا تھا جو اس کی مانے۔ انہوں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

دیکھو بیٹا! اس نے تو نہیں کہا نا ایک دوسرے سے نفرت کرو۔ وہ تو سراپا محبت ہے۔ ہم نے اس کی محبت کی تفہیم کو ہی بدل دیا ہے۔ ہم اس کو مانتے تو ہیں مگر اس کی ماننے کو تیار نہیں۔

مگر ماں یہاں تو ہر کوئی فرقے کی دوکان کھولے بیٹھا ہے۔ جنت کا سرٹیفکیٹ بھی ہاتھوں میں لے کر لوگ بیٹھے ہیں۔ اب تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ مخالف فرقے سے رشتے بھی نہیں کیے جاتے۔ ان کو اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ اس نے دل میں شدید درد محسوس کرتے ہوئے کہا۔

بیٹا جب دین پر عمل کی بجائے انسانوں نے ایک دوسرے کی باتوں پر عمل کرنا شروع کیا تو ایسا تو ہونا تھا۔ روز کوئی فرقہ نکلتا رہا اور فرقوں سے انسان بھی اسی تیزی سے باہر نکلتے رہے۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ فرقے تو تھے مگر انسان کہیں نہیں تھے۔ صرف ہر طرف فرقہ پرست افراد کا ٹولہ تھا۔

شاید ماں سچ کہتی تھیں۔ ایک ویل چیئر پر بیٹھی بوڑھی ماں خدا کو دل سے مانتی تھی۔ وہ انسانوں کو خدا کی سب سے خوب صورت نشانی کہتی تھیں مگر فرقوں کے لبادے میں ملبوس افراد صرف مخصوص فرقے کا لبادہ اوڑھے افراد کو ہی اپنا قرب عطا کرتے تھے۔

ہوا کیا ہے بیٹا؟ ماں نے فکر مند ہوتے ہوئے سوال کیا۔

بہت سی بحثیں لاحاصل ہوتی ہیں ماں جی! بہت سی باتیں ان کہی رہ جائیں تو بہتر ہے۔ بہت سے الفاظ جب اظہار کا روپ دھار لیتے ہیں تو اتنی خطرناک شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ ہمارے وجود کی پوری عمارت ان کے

ڈر سے منہدم ہو جاتی ہے۔ میری خاموشی ہی سارے سوالوں کے جواب ہیں۔

اس کی ماں کچھ نہ سمجھی تھیں۔ مبہم لفظوں کی تشریح کہاں ممکن ہوتی ہے۔ وہ بس اس کے چہرے کو پڑھتی تھیں۔ وہ لفظوں کی گہرائی کو چہروں پر بننے والی فکر کی لکیروں میں ڈھونڈ لیتی تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھیں اس کا چہرہ فکر کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

☆......☆......☆

افتخار کی ماں نے بچپن سے ہی دکھ کو سکھ سے الجھتے ہی دیکھا تھا۔

بچپن میں منحوس بیٹی کا خطاب انہیں باپ کی طرف سے ملا تھا جب پیدائش کے کچھ دنوں بعد ان کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔ باپ نے شروع سے ہی انہیں اپنی محبت اور شفقت سے محروم کر دیا تھا۔ بڑے بھائی چھوٹے ظرف کے مالک تھے۔ وہ گھر کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ ان کی پیدائش کے چھ سال بعد ہی دو بھائیوں کی شادی ہو گئی مگر دونوں بڑے بھائیوں نے چھوٹی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں ہر خوشی سے دور رکھا۔

باپ نے شروع سے ہی رخ پھیر لیا تھا۔ انہوں نے محبتوں کی زنبیل کا رخ دوسری بیوی کی جانب موڑ لیا تھا۔ وہ اس زنبیل سے صرف حقارت اور نفرت ہی پاتی تھی۔ ایک گھر میں سوتیلی ماں اور بھائیوں کے در پر عزت کا ٹوکرا لے کر روز فقیروں کی طرح روٹی کے لیے سوال کرتیں تب بھی وہ سینکڑوں بار مر جاتی تھیں۔ بھابیوں کے طعنوں سے ان کے چہرے پر روز صبح کو فکر کی پہلی کرن پڑتی۔ گھر کی نوکر کو گھر کے سب سے نچلے حصے میں جہاں کپڑے رکھے جاتے تھے، رکھا جاتا تھا۔ پرانے میلے کپڑوں کے ساتھ ایک انسان بھی وہیں پلا بڑھا تھا۔ اسی کمرے میں پرانی کتابوں کو کھوجتے کھوجتے وہ کافی الفاظ سیکھ گئی تھیں۔ قریبی سکول کی ایک استانی نے اتنا رحم کیا تھا کہ اسے اردو پڑھنے لکھنے کے قابل بنا دیا تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں کپڑوں کے ساتھ بڑی ہوتی لڑکی جب بھابیوں سے برداشت نہ ہوئی تو ایک عمر رسیدہ شخص کے کھونٹے سے چند روپوں کے عوض باندھ دی گئی۔ عمر رسیدہ شاید خدا ترس تھا۔ اس نے انہیں پورے دل سے اپنایا۔ بھائیوں اور باپ کے خوف کی شکار لڑکی کو پہلی دفعہ کسی مرد سے خوف محسوس نہ ہوا تبھی کچھ عرصے بعد افتخار پیدا ہوا۔ کچھ سالوں بعد اونچے رستوں پر چلتی گاڑی نے انہیں کچلا تو زندگی پھر جیسے بے رحم ہو گئی۔ ویل چیئر پر شوہر کی خدمت کرتیں معذور ماں نے اس سے امید کی

تمام کرنیں باندھ لیں۔اب وہی ان کی آرزو کا واحد ستارہ تھا۔وہی ان کی تمناؤں کا چاند تھا۔

وہ روز اسے دیکھ کر جیا کرتی تھیں۔اگرچہ اس کے والد بھی ابھی حیات تھے مگر وہ حد سے زیادہ لاغر ہو چکے تھے۔ماں نے ان کی خدمت میں کسی طرح کی کمی نہیں رکھی تھی۔ان کے شوہر نے اچھے وقتوں میں ایک گھر اسلام آباد میں سستے داموں لے لیا تھا جب کہ کچھ عرصہ پہلے اس زمین کو بیچ کر انہوں نے کروڑوں روپے کمائے۔ان کے اونچے گھر پر دولت کے سائے لہرائے تو بھابیاں اور بھائی بھی گدھوں کی صورت منڈلانے لگے۔" پیاری بہن اور خوبصورت نند " جیسے جملوں سے اس کی تواضع ہونے لگی۔اپنے علاقے میں انہوں نے ایک بہت بڑا گھر خرید لیا۔اسی گھر کے ایک کونے میں ایک بڑے بھائی نے گویا قبضہ کر لیا۔اونچے گھر میں چھوٹے ذہن آوارہ پرندوں کی طرح رہنے لگے۔ان کی نظر ماں کی جائیداد پر تھی جو کہ انہیں کسی صورت نہیں مل سکتی تھی کیوں کہ جائیداد افتخار کے نام پر تھی۔افتخار کے جوان ہونے پر بھابھی اور بھائی بھی کسی حد تک سدھر گئے تھے لہٰذا اب اکثر منافقت سے زیادہ مروت میں بہن کا خیال رکھ جاتے۔

وقت شاید منافق کو بھی بدل دیتا ہے۔وقت ہی سب سے بڑا استاد ہے۔اس کے سبق سب سے زیادہ آزمودہ ہوتے ہیں۔پل پل بدلتے رشتوں اور رویوں کی اونچ نیچ کو اس گھر سے زیادہ کہاں محسوس کیا جا سکتا تھا جہاں نفرتوں نے یکدم محبت کی سیڑھی پر سفر شروع کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اس کا کمرہ میوزک کی آواز سے کسی تھیٹر ہال کا منظر پیش کر رہا تھا۔سامنے موجود بڑے سے شیشے کی کھڑکی سے اڑتے پرندے بھی جھانک کر عجیب سے شور میں بستر پر اچھلتے انسان کو دیکھ رہے تھے۔کمرہ بے ہنگم میوزک کے شور سے تھرتھرا رہا تھا۔دس منٹ پہلے یہ ایک خوب صورت کمرہ تھا جس کا نقشہ ارسلان نے کافی حد تک بگاڑ دیا تھا۔انگلش میوزک کی اٹھان پر اس کے اٹھتے قدم اور بیڈ سے دینگا مشتی کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ تکیے سمیت چادر اور اس کے کپڑے پورے کمرے میں پھیل گئے تھے۔دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ دروازے پر جیسے دستک ہو رہی ہے۔

ریموٹ سے ہوم تھیٹر کو بند کر کے غور سے دوبارہ آواز سننے کی کوشش کی۔دروازے پر واقعی دستک ہو رہی تھی۔

وہ اٹھا۔دل میں دعا کی کہ ماں نہ ہوں اگرچہ ان کے ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کیوں کہ بیس منٹ

پہلے وہ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے گئی تھیں اور وہاں سے دیر سے ہی واپس لوٹا تھا۔

آہستگی سے دروازہ کھولا۔ سامنے نیہا ہاتھوں میں چائے پکڑی جانے کب سے کھڑی تھی۔ چائے پر جمی چائے کی ملائی کی تہہ بتا رہی تھی کہ وہ کافی دیر سے دروازہ کھٹکھٹاتی رہی ہے۔

جی چائے دینی تھی۔ اس نے معصومیت سے کہا۔

تو دی کیوں نہیں۔ ارسلان نے شرارتی انداز میں جواب دیا۔

آپ نے میوزک کافی تیز آواز میں لگایا ہوا تھا۔ اس لیے شاید آپ کو دستک کی آواز سنائی نہیں دی۔ دوبارہ اسی معصومیت سے جواب دیا گیا۔

جی ٹیبل پر رکھ دیں۔

ارسلان نے دیکھا کہ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بکھری چیزوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

یہ میرے کپڑے ہیں۔ ارسلان نے ایک کپڑا زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

لیکن یہ زمین پر کیوں پڑے ہیں۔ انتہائی سادہ جواب دیا گیا۔

کیوں کہ میں جوش میں کپڑے زمین پر پھینک دیتا ہوں۔ دوبارہ شریر لہجے میں کہا گیا۔

”جی، یہ تو غلط بات ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ اچھی لگتی ہے۔ کوئی جوش میں آپ کو کھڑکی سے نیچے پھینک دے تو۔۔۔“

ارسلان کو قطعاً توقع نہیں تھی کہ نیہا ایسا بھی کچھ کہہ سکتی ہے۔ وہ ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگا۔

چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔

ارسلان نے سپ لیتے ہوئے جان بوجھ کر کہا۔ اسے امید تھی کہ نیہا برا مان جائے گی۔

لائیے پھر سے گرم کر کے لاتی ہوں۔

ارسلان نے نہ چاہتے ہوئے بھی مگ اسے پکڑا دیا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ اس لڑکی کو جان بوجھ کر چھیڑے۔

تھوڑی دیر بعد دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی۔

جی آ جائیے۔ میں ہی ہوں اور ادھر بھی آپ ہی ہوں گی۔ اس گھر میں اور تیسرا کون ہے۔

دستک دینا اچھی بات ہے ارسلان صاحب! بعض اوقات کھلے دروازے موت کی طرف بھی لے کر جاتے ہیں۔

اس نے کس ترنم میں بات کی تھی مگر ارسلان اس کی بات کا مفہوم بالکل نہیں سمجھ سکا تھا۔

نیہا احمد آپ اس بات کی تشریح کر سکتی ہیں۔غور سے اس کی طرف دیکھتے اس نے سوال کیا۔

آپ کو برا نہ لگے تو کمرہ سیٹ کر دوں؟ گفتگو کو بالکل الگ رخ دے دیا گیا۔

تین چیزیں بکھری ہیں۔وہ میں خود سمیٹ لوں گا۔ارسلان کو پسند نہیں تھا کہ وہ کسی کا احسان لے۔

پہلے تین چیزیں بکھرتی ہیں پھر پورا گھر اور پھر انسان بکھر جاتا ہے۔لہذا تین چیزوں کو وقت پر سمیٹ لیا جائے تو بہت سی چیزوں کو بکھرنے سے بچایا جا سکتا ہے۔

نیہا نے شدید معصومیت سے کہا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

عجیب سی دکھی لڑکی تھی۔گفتگو میں خود کو بیان کر دیتی تھی مگر ہمیشہ اسے نے نیہا کو خود سے الجھتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔اگرچہ ماں نے اس کی پوری داستان سنا دی تھی اور اسے خصوصی نصیحت کی تھی کہ وہ اسے زیادہ تنگ نہ کرے مگر اب ارسلان کا دل کر رہا تھا کہ اس لڑکی کے اندر موجود اصلی لڑکی کو باہر لائے۔

تین بٹا تین ڈرامہ چلتا تھا وہ دیکھتی تھیں آپ؟

اس کے سوال پر صرف سر کو نفی میں ہلایا گیا۔

بس ایسے ہی تین چیزوں سے مجھے یاد آیا۔ویسے یہ تین چیزیں کون سی ہیں۔جس کو بکھرنے سے بچایا جائے تو پورا گھر بچ جاتا ہے۔

اس نے پھر سے نیہا کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

جی فی الحال تو آپ کی شرٹ، آپ کا تکیہ اور چادر۔۔۔۔۔

اس کے جواب پر ارسلان نے زور سے قہقہہ لگایا۔اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اسے اس قسم کا جواب سننے کو ملے گا۔

یعنی کسی بھی گھر کو بچانا ہے تو ارسلان کی شرٹ، تکیے اور چادر کو سمیٹنا ہو گا۔

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو وہ بری طرح گھبرا گئی۔

میرا یہ مطلب نہیں تھا۔اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

ارسلان اب اس کی گھبراہٹ سے بھی محظوظ ہو رہا تھا۔

پھر کیا مطلب تھا آپ کا۔پھر سے اسے چھیڑا گیا۔

کچھ نہیں۔۔آپ چائے پی لیں۔پھر ٹھنڈی ہو جائے گی۔

ارسلان نے نیہا کو انگلیاں بھینچتے دیکھا۔

کہیں چوتھی شے ارسلان کی چائے تو نہیں نا۔۔وقت پر پی لیتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر سے گھر بکھر جائے۔

ارسلان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چائے کا مگ پکڑا۔دل ہی دل میں وہ قہقہہ لگا رہا تھا جب کہ اس کا چہرہ بری طرح سے مرجھایا ہوا تھا۔

میں جاؤں؟ گھبراہٹ بھرے لہجے میں نیہا نے سوال کیا۔

اوہ، کمرہ نہیں سمیٹیں گی آپ۔اسے محسوس ہو رہا تھا کہ نیہا کا بس نہیں چل رہا ورنہ شاید قریب موجود شیشے کا جگ اس کے سر پر دے مارتی۔

نہیں۔۔۔مختصر سا جواب آیا۔

اب کیا ہوا؟

کچھ نہیں۔آپ بس مذاق کرتے رہتے ہیں۔سیریس نہیں ہوتے۔ارسلان نے اسے دیکھا۔آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔تبھی وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔

عجیب سی لڑکی ہے۔اعتماد زیرو فی صد ہے۔جس قسم کے حالات کا سامنا کیا ہے یہ بھی غنیمت ہے کہ جی رہی ہے۔نیہا احمد ارسلان کے ہوتے ہوئے کوئی بے ہمت رہ جائے ممکن نہیں۔یہ ارسلان کی توہین ہے۔دیکھ لینا میں تمھیں ایک پر اعتماد لڑکی بنا دوں گا۔اس نے خود سے کہا اور چائے کے مگ پر جھک گیا۔

☆......☆......☆

کشمیر کی کھلی فضا میں سانسیں بھی کتنی فرحت افزا محسوس ہوتی ہیں۔ ہر سانس دوسری سانس سے زیادہ تازہ اور کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ گھر سے دور ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا تھا۔ سرسبز ٹیلا، جو گھاس سے ڈھکا ہوا تھا۔ قریب ہی چنار کے درخت اور ساتھ ہی بہتا پانی منظر کو جاذب نظر بنا رہا تھا۔ وہ اکثر یہاں آتا تھا۔ محبت ہونے سے پہلے بھی اسے اس جگہ سے حد سے زیادہ محبت تھی اور محبت کے بعد اس جگہ نے اسے اپنے سحر میں مکمل جکڑ لیا تھا۔

تھرماس میں سے چائے پیالی میں انڈیلتے ہوئے وہ ان لمحوں کو سوچ رہا تھا جب وہ نیا نیا یونیورسٹی آیا تھا۔ جانے زرینہ کو یاد کرنے آیا تھا یا خود کو زرینہ میں ڈھونڈنے مگر کچھ بھی تھا وہ اس وقت یونیورسٹی میں خود کو زرینہ کے روبرو محسوس کر رہا تھا۔

ان سے ملو زرینہ، یہ ہیں افتخار صاحب، کشمیر سے آئے ہیں۔

کیسے ہیں آپ کشمیری صاحب۔۔۔

یہی انداز تو اسے بھایا تھا اس کا۔۔۔

چائے پیتے ہوئے وہ مزید اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

سنا ہے کشمیری خوب صورت ہوتے ہیں۔ آپ کی دفعہ حسن کیا ختم ہو گیا تھا۔

وہ مسکرایا۔ ہر بار اسے یہ جملہ لازمی یاد آتا تھا۔

کشمیری خوب صورت ہوتے ہیں۔ دوبارہ آواز کانوں میں گونجی۔

ارسلان، تمہارا دوست کچھ زیادہ خاموش نہیں رہتا۔ لگتا ہے کشمیر کے ک سے لاہور کے ل تک پہنچنے میں اسے پورے چار سال لگ جائیں گے۔

زرینہ کشمیر کے ک سے لاہور کے ل تک ایک گ بھی پڑتا ہے۔ سنا ہے اسے گدھا کہتے ہیں۔

اوہ تو جناب اچھی تنقید بھی کر لیتے ہیں۔

ھاھاھا، ٹیلے پر چلنے والی ہواؤں نے پھر سے اسے اپنے سحر میں لے لیا۔

جانے کتنی باتیں تھیں۔ کتنی یادیں تھیں جو ختم ہی نہیں ہوتی تھیں۔ چائے کے ہر سپ میں ایک یاد چھپی تھی۔

تمھیں پتہ ہے افتخار! سردیوں میں مجھے زکام جلدی ہو جاتا ہے۔

اوہ زکام سے سرخ آنکھیں دیکھنے کا مجھے کتنا شوق ہے۔ بڑا شوق ہے تمھاری سرخ ناک دیکھوں کیونکہ آج کل کی لڑکیوں کے سرخ گال تو دیکھنے سے بھی نہیں ملتے۔

افتخار تم پورے پاگل ہو۔

ہاہاہاہا۔

افتخار تم پورے پاگل ہو۔ کتنی دیر آوازیں اس کے ذہن میں گونجتی رہیں۔ چائے کی پیالی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے دوبارہ کپ کو سرے سے چائے سے بھرا۔

یار ارسلان! یہ تمھارا دوست چائے کیوں نہیں پیتا۔ کہیں منے کو دودھ کی عادت تو نہیں نا۔

ھاھاھا، زرمینہ یہ کہتا ہے چائے پیوں گا تو کالا ہو جاؤں گا۔

اس سے زیادہ یہ کیا کالا ہوگا۔

اس نے غور سے چائے کی پیالی کو دیکھا۔ اس کا گندمی جسم پچھلے تین سال میں کتنا نکھر گیا تھا۔

آنکھیں بند کئے چائے کے سپ کو یادوں کے حلق میں انڈیلتے ہوئے سوچنے لگا کہ محبت کتنی ظالم ہوتی ہے۔ کسی بیماری کی طرح ذہن سے چپک ہی جاتی ہے۔

زرمینہ ان چار سالوں میں یہ کشمیری چائے کی پیالیوں میں تمھیں ڈھونڈتا ہے۔ اسے چائے سے الجھن ہوتی تھی مگر اب چائے نہ ملے تو یہ الجھ جاتا ہے۔

یادوں کے مکیں نے تیسری پیالی چائے کی تیار کی۔

افتخار! بے شک تم پڑھا کو ہو۔ لیکن یاد رکھنا لاہور کے ل کو کبھی لو نہ سمجھنا۔ ورنہ رنگ پہنچتے جسم سے بھی رہا ہو جاؤ گے۔

میں محبت پروف ہوں۔ ھاھاھا، محبت پروف۔۔۔۔

ارسلان اسے بتاؤ۔ واٹر پروف موبائل بھی پانی میں کچھ عرصہ رہے تو پانی کے اثر میں خود کو ڈھال لیتا ہے۔

یہ جو پروف کا نعرہ لگا کر آتے ہیں یہ سب سے پہلے متاثر ہوتے ہیں۔ سنو کشمیری لڑکے، سنبھل کر چلنا۔

سنبھل کر۔۔۔۔ہونہہ۔۔۔اتنا سنبھلا کہ محبت کی دلدل میں بری طرح گر گیا۔وہ چلایا۔

زرینہ، محبت میرے رگ و پے میں اتر گئی ہے۔ماں کہتی تھی افتخار تو میرا فخر تھا۔ماں کو کوئی کہہ دے تمھارا فخر محبت کے فقر میں مارا گیا ہے۔

محبت انسان کو اپنی ذات سے بھی دور کر دیتی ہے۔دوسرے شخص کے قالب میں ڈھال دیتی ہے۔اسی کا خیال ہمہ وقت ذہن میں سوار رہتا ہے۔شعور سے لاشعور دونوں ہی محبت کے آگے بے بس دکھائی دیتے ہیں۔ خواب بھی اسی کا عکس بن کر رات کو روز تکئے کے سرہانے اسی کی یادوں کی پتنگ اڑاتا رہتا ہے۔وہ محبت سے ڈرتا تھا۔وہ ارسلان کو محبت سے باز رہنے کو کہتا تھا۔وہ خود محبت کی راہ میں زندگی سے بے پرواہ ہو گیا۔

تم دوستوں کے لیے دودھ چھوڑ سکتے ہو تو کسی کو بھی چھوڑ سکتے ہو۔

ھاھاھا۔

ارسلان اسے کہو چائے سے کم دوستی کرے ورنہ چائے اتنی پکی دوست بن جاتی ہے کہ انسان کا تعلق اس کے وجود سے بھی ختم کر کے تنہائی سے جوڑ دیتی ہے۔یہ لڑکا جتنی جلدی بدل رہا ہے مجھے ڈر لگتا ہے کسی دن یہ ایک دم ہم سب کو حیران نہ کر دے۔

اس دن چائے پر چائے پیتے دیکھ کر زرینہ نے کچھ ایسے الفاظ کہے تھے اور وہ بس اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

زرینہ، میری دوستی چائے سے ہو گئی۔اس نے خود سے کہا۔ہوائیں اسی رفتار سے چل رہی تھیں۔

اب میں تمھارے محبت میں ہجر کی چائے پیوں گا اور تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اتنی پیوں گا کہ تم کہو گی کہ افتخار تم نے مجھے حیران کر دیا۔

اس نے خود سے کہا اور پھر سے یادوں کے رستے کا ہمسفر ہو گیا۔

☆......☆......☆

عجیب سا لڑکا ہے۔کسی بھی وقت رلا دیتا ہے۔کوئی بھی بات کہہ کر ہنسا دیتا ہے۔دکھ دیتا ہے تو خیال بھی نہیں رہتا کہ کسی کے دکھی دل پر کیا گزرتی ہو گی۔عجیب سا لڑکا ہے کوئی بات کرتا ہے تو خیال بھی نہیں کرتا کہ کسی کے دل پر اس کے لفظوں کا کیا اثر ہو گا۔سوچے بنا ہی بات کر جاتا ہے۔بہت ہی عجیب قسم کا لڑکا ہے کسی کے آنسو بھی

دیکھ نہیں پاتا۔ کسی کی بھیگتی آنکھیں اسے بالکل متاثر نہیں کر پاتیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہر احساس سے عاری ہو۔

وہ ہمیشہ کی طرح شیشے میں اپنے عکس سے ارسلان کی شکایت کر رہی تھی۔

آنٹی کہتی تھیں اسے دل رکھنا آتا ہے۔ اسے دل تو دور کی بات مروت کا بھی نہیں پتہ۔ کل کتنا تنگ کیا اس نے مجھے۔۔۔ اگر میں مجبور نہ ہوتی تو چند لمحوں میں یہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی۔

مجبوری میں انسان کو کتنا کچھ سہنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کی باتیں بھی جنہیں وہ جانتا ہی نہیں۔

اس نے آنسو صاف کیئے اور بوجھل قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔

بیٹا سب ٹھیک ہے نا! آنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

جی آنٹی جی! تین لوگوں کے گھر میں کیا خراب ہو سکتا ہے۔

اس نے شگفتگی سے جواب دیا مگر لہجے نے دل کا ساتھ نہ دیا۔

تین لوگوں کے گھر میں کچھ بھی خراب ہو سکتا ہے، کسی کے ساتھ تعلقات بھی۔

انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔ دل چاہا کہ ارسلان کا سر پھوڑ دے جس کی وجہ سے آنٹی جانے کس قسم کے شک کر رہی تھیں۔ وہ سامنے ہوتا اور بولنے کی ہمت ہوتی تو صاف کہتی۔ ارسلان تم مر جاؤ۔ تمھاری وجہ سے میں مر رہی ہوں۔

سب ٹھیک ہے نا، اسے خاموش دیکھ کر آنٹی نے پھر سے سوال کیا۔

جی، بے فکر رہیے۔

خراب تعلقات۔۔۔ وہ اندر ہی اندر بڑبڑائی۔ خراب تعلقات کے لیے پہلے تعلقات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ارسلان اس کا کیا لگتا ہے جس سے اس کے تعلقات خراب یا صحیح ہوں۔ اس نے دل میں سوچا اسے آنٹی کی بات قطعی اچھی نہیں لگی تھی۔

بیٹا! تمھارے انکل کہہ رہے تھے آج ان کا چکن منچورین کھانے کا دل کر رہا ہے۔ بنا سکتی ہو نا!

جی! سوالیہ جی کے ساتھ اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

شاباش بنا دینا پھر۔۔۔ ارسلان کو بھی پسند ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی وہ ان سنا کر کے اپنے کمرے

میں چلی گئیں۔

اوہ خدایا۔میں نے کبھی بریانی ڈھنگ سے نہیں بنائی یہ چکن منچورین۔۔۔۔۔۔وہ سخت گھبرا گئی تھی۔کتنی دیر وہ آگے پیچھے ٹہلتی رہی۔اضطراب سے انگلیاں آپس میں پھنس گئی تھیں۔آنٹی آپ کو اللہ پوچھے۔کس امتحان میں مبتلا کردیا۔اس نے غصے سے کہا تبھی ارسلان کو سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دیکھا۔

اوہ میڈم!آج سیڑھیوں پر چائے دینے کا انتظار تو نہیں کررہی تھیں نا!

وہ اپنے اپ میں الجھی ہوئی تھی۔وہ پریشان ہوتی تھی تو خود سے شدید الجھ جاتی تھی۔

میں آپ سے پوچھ رہا ہوں مس نیہا!ارسلان کی آواز نے اسے چونکادیا۔

جی نہیں!کچھ نہیں۔۔۔

چائے پینی ہے کیا آپ کو؟

جی کتنی چائے پلائیں گی۔تین دفعہ تو صبح سے پلا چکی ہیں۔خیر سے ڈیری فارم تو نہیں کھول لیا آپ نے جو اتنا وافر دودھ آرہا ہے کہیں سے۔ارسلان نے اسے جان بوجھ کر چھیڑتے ہوئے کہا۔

آپ کے گھر میں ملک پیک کی چائے بنتی ہے۔دیسی دودھ کی نہیں۔

اس کے مختصر جواب نے پھر سے اسے لاجواب کردیا۔

پریشان کیوں ہیں۔کچھ کھو گیا ہے کیا؟

ارسلان کے استفسار پر ایک بار اس کا دل کیا کہ اسے بتادے پھر دل میں سوچنے لگی جانے وہ کیا سوچتا ہوگا۔

بس ایک مشکل آن پڑی ہے۔بالاخر وہ بول پڑی۔

ارسلان اور مشکل۔۔۔فوراً سے پہلے بتایئے یا میں ہوں گا یا مشکل۔۔۔

جی۔۔

وہ جھجکتے ہوئے کہنے لگی۔

ارے محترمہ بلاخوف بولیئے۔ارسلان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

آنٹی نے کہا ہے چکن منچورین بنادوں انکل کو پسند ہے اور مجھے۔۔۔

ارسلان نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی قہقہہ لگایا۔اس لمحے وہ اسے شدید زہر لگا۔

عجیب انسان ہے کسی بھی وقت قہقہہ لگا دیتا ہے موقع نہیں دیکھتا۔اسنے غصے سے ارسلان کی طرف دیکھا۔

تو یہ مسئلہ تھا؟

جی۔۔اس نے غصے سے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

اب آپ کیا کریں گی۔منچورین بنانے کیلیے کسی چائینیز کو بلائیں گی کیا؟ارسلان نے تنگ کرتے ہوئے کہا۔

مجھے لگتا ہے جیسے آپ سے کہہ کر میں نے ہی غلطی کی۔

اس نے شدید غصے سے جواب دیا اور کچن کی طرف جانے لگی۔

سنئے!اس کی آواز سن کر وہ رک گئی۔کاش یہ پھر سے کچھ الٹا سیدھا نہ کہہ دے۔اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

جی فرمایئے۔

آپ کو انٹرنیٹ استعمال کرنا آتا ہے نا۔

جی آتا ہے۔مختصر جواب دیا گیا۔

پھر آپ یوٹیوب پر طریقہ دیکھ لیں۔میرے کمرے میں لیپ ٹاپ موجود ہے۔

ارسلان نے ہنستے ہوئے کہا تو اس نے دل میں خدا کا لاکھ شکر ادا کیا۔

بہت شکریہ آپ کا۔۔اس نے تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا۔

کوئی بات نہیں اور ہاں!کمرے میں تین چیزیں نہیں ہیں۔ارسلان کے سوال نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا۔

کون سی تین چیزیں۔

وہی جسے سنبھال کر گھر کو بکھرنے سے بچایا جا سکتا ہے نا۔ارسلان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو وہ زچ ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

وہ جا چکا تھا۔عجیب شخص ہے۔مشکلیں حل کرتا ہے مگر طعنے لازمی دیتا ہے۔اس نے سوچا اور ارسلان کے

کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔

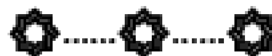


صبح سویرے کی بارش نے ماحول کو خاصا خوش گوار بنا دیا تھا۔ موسم قدرے صاف ہو چکا تھا۔ بادلوں نے اب بھی آسمان کو گھیر رکھا تھا۔ سورج کی روشنی بادلوں سے لڑ کر زمین پر مبہم سوال کی طرح پھیل رہی تھی۔

کشمیر کی خوب صورت وادی میں کھلتے پھولوں کے ساتھ وہ بھی جوان ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے غزال کی آنکھیں تھیں، چہرہ جیسے کشمیری سیب جیسا سرخ و سپید، ستواں ناک اور ہونٹ جیسے سرخ غازے میں سے ابھرتے ہوئے کسی شاعر کا حسین تخیل۔ لمبی صراحی دار گردن میں سے جھومتی مالا کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے سب سے خوب صورت مور کو قیمتی ہیرے کا ہار پہنا دیا ہو۔ جب وہ بولتی تو جیسے لڑکوں کی کائنات ٹھہر جاتی۔ محبت کی بارش میں ہر دم نہائی ہوئی، خوبصورتی کی شال اوڑھے، ذہانت و فطانت کی تعلیم لیے، ستھرے اخلاق کا دستر خوان ہر سو سجائے وہ جیسے کسی دیو مالا کہانیوں کی شہزادیوں کی طرح تھی۔ اس کے پورے وجود سے محبت نمایاں تھی۔ وہ ہنستی تو موسم میں ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ وہ چلتی تو راستے رک جاتے۔ وہ باتیں کرتی تو خاموشی اسے غور سے سنتی۔ وہ چپ رہتی تو صدائیں اس کیلیے چیختیں۔ وہ مہکے ہوئے پھول کی ڈالی جیسی تھی۔ ہر وقت مہکنے والی، ہر سو چہکنے والی، کبھی ایسا لگتا جیسے پھولوں کی خوشبو میں ڈھل رہی ہو۔ کبھی ایسا لگتا جیسے ستاروں کے ہمراہ عشق کے آسمان پر مچل رہی ہو۔ کبھی وہ مہکا ہوا پھول لگتی۔ کبھی عشق کا پابند اصول لگتی۔ کبھی اس کے سامنے اپنی ذات بھی دھول لگتی۔

وہ جو بھی تھی انہی وادیوں کو ہر دم معطر کرنے والی لڑکی تھی۔ ہر دم انہی وادیوں میں اندھیرے میں چمکتے بلب کی طرح چمکتی تھی۔ جیسے وہ اس وادی کی جان تھی۔ جیسے یہیں کی آن تھی۔ یہاں کی پہچان تھی۔ ٹھنڈے چشموں جیسی شفاف دل والی لڑکی، جو پرندوں کے ہمراہ باغ زندگی میں ٹہلتی رہتی۔ جو مینا و کوئل کے ہمراہ زندگی کے نغمے گاتی۔۔ ہر سو حیات کے سر بکھیرتی لڑکی۔ ہر سو محبت تقسیم کرتی لڑکی۔

وادی میں مہکے پھول کی طرح مہک رہی تھی۔



کتنی دیر قد آدم شیشے میں وہ خود کو سنوارتی رہی۔ وہ نکھری لڑکی، وہ تراشی انگلیوں کو بالوں میں بکھیرتی، ہر دم کائنات پر اپنی خوب صورتی کا بم برساتی بس اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ سحرش محسوس کر رہی تھی کہ افتخار جب سے آیا ہے سب سے الگ تھلگ رہ رہا ہے۔ وہ اس کا نہ صرف کزن تھا بلکہ سب سے بہترین دوست بھی تھا اور اسے افتخار کی بجائے "افتی" کے نام سے پکارتی تھی۔ پہلے جب بھی وہ چھٹیوں میں آتا تھا تب افتی اس سے یونیورسٹی کی ڈھیر ساری باتیں کرتا، ارسلان اور زرمینہ کے قصے اور ہاسٹل کی شرارتیں سب بیان کرتا مگر اس بار افتخار ایک الگ روپ میں نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں جاتی وہاں نہیں ملتا۔ باہر ڈھونڈتی تو پتہ چلتا موصوف کسی دوست کے ہاں نہیں۔ آج اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ کمرے میں ہی مل گیا۔

وہ جس کے دوست ہوئے ہم، اب وہ اتنا بے اعتنا ہو گیا۔ اب تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ تمہیں ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اس نے شکوہ کرتے ہوئے افتخار سے کہا۔ وہ سامنے کرسی پر پاؤں پسارے کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔

ھاھاھا، سوری دوست! اس بار واقعی ایسا ہو رہا ہے۔ امی سمیت تمہیں بھی وقت نہیں دے پا رہا۔

افتخار نے مردہ سی تاویل گھڑی۔

آخر تمھاری اتنی مصروفیت کی وجہ جان سکتی ہوں۔ وہ افتخار جو دن رات ہماری نظروں کے سامنے رہتا تھا اب اسے ڈھونڈنے کے لیے ہمیں اس کی باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ یہاں ہوتے ہوئے بھی ہمیں نہیں ملتا تو میں اور تمھاری ماں مل کر تمھارا ذکر شروع کر دیتے ہیں۔

اس کے الفاظ کا شاید افتخار پر صحیح اثر ہوا تھا کہ وہ کتاب بند کر کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

سحرش واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ مجھے ادراک ہے کہ میرا وقت خود میرے لیے نہیں رہا مگر اس پر تم لوگوں کا حق ہے۔ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

دیکھو افتی! یہ جو تم نے پراسراریت سی قائم کر رکھی ہے نا اس سے ہوگا کچھ نہیں۔ جو تم چھپانا چاہتے ہو گے وہ تمھارے وجود سے ہی عیاں ہو جائے گا۔ پراسراریت کبھی مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتی۔ کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔

سحرش نے افتخار سے بات نکلوانے کے لیے جتن کرتے ہوئے کہا۔

کیسی پراسرایت! پراسرایت تو تب ہو جب کوئی ریت کی دیوار کی طرح سامنے سے پھسل رہا ہو اور اسے ہاتھوں سے روکنا ہو اور کسی کو اس المیے سے آگاہ بھی نہیں کرنا۔ میں وہی افتخار ہوں۔ بس اب میرے اندر موجود افتی ہی مجھ سے خار کھانے لگا ہے۔

اس نے درد میں ڈوبے لہجے میں جواب دیا۔

افتی! ریت کی دیوار کبھی کوئی ہاتھ سے نہیں تھام سکا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں تمھیں جانتی ہوں۔ تم نے اپنے اندر ہی خود کو چھپا لیا ہے۔ تم کوئی راز نہیں جو مدفن رہو گے۔ لوگ تمھیں بے رحمی سے تمھاری ذات سے کھرچ کر باہر نکال دیں گے۔ رہنے کے لیے سب سے بری جگہ چنی افتخار تم نے۔۔۔۔ بے شک بہت بری اور بے رحم جگہ چنی۔

وہ مسلسل لفظوں کے حملے کر رہی تھی مگر افتخار جب زرمینہ کے سامنے عیاں نہ ہوا تو سحرش کے سامنے کیسے کھل سکتا تھا۔

سحرش! تم نے کبھی محبت کی ہے۔ افتخار نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک کہا۔

وہ اس افتاد کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔

افتی یہ کیسا سوال ہے؟ محبت گلی کوچے میں تقسیم کرنے والی شیرینی تو نہیں کہ کہیں بھی ہو جائے اور کہیں بھی مل جائے۔

اگرچہ وہ سوال کے لیے تیار نہ تھی پھر بھی اپنی طرف سے اسے جواب دے دیا۔

سحرش، محبت ہونا سوال نہیں۔ سوال یہ ہے کہ محبت ہونے کے بعد انسان سوالی کیوں بن جاتا ہے؟ شاید محبت انسان کو فقیر کا روپ عطا کرتی ہے۔ ابھی دیکھو نا میری یونیورسٹی میں ایک لڑکا تھا کاشف، اسے کسی سے محبت ہو گئی۔ جب سے محبت ہوئی ہے وہ اسے یاد کرتا رہتا ہے۔ وہ لڑکی کہتی ہے ڈیجیٹل دور میں ایسی محبت صرف جھوٹ ہی ہو سکتی ہے جب کہ وہ سوالیوں کی طرح عقیدت کا سہرا سجائے اور امید کی راہ میں آنکھیں بچھائے اس لڑکی کو دل کے مکاں میں تکتا رہتا ہے۔

سحرش سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اپنی کہانی سنا رہا ہے یا کہانی میں موجود افتخار کو کاشف بن کر تھپکی دے رہا ہے۔

کچھ ہو نہ ہو اس کہانی سے اس کا تعلق تو ضرور بنتا ہے اس نے دل میں سوچا۔

اور تمھیں کیا لگتا ہے محبت سچی بھی ہو سکتی ہے؟

سحرش نے لفظوں کا وار کیا۔

پتہ نہیں محبت کیسی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اسے دماغی خلش کہہ دیتے ہیں، کچھ افراد اسے وجود کی دریافت قرار دیتے ہیں۔ چند لوگ اسے انعام اور کچھ اسے سزا کہتے ہیں۔ جس کے لیے جیسا روپ دھارتی ہے وہ اس کی ویسی تشریح کرتا ہے۔ محبت سچی ہوتی ہے یا نہیں مگر میں اتنا جانتا ہوں محبت میں انسان سچا ضرور ہو جاتا ہے۔

افتخار نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

مگر مجھے لگتا ہے کچھ لوگ محبت میں سچ کو صرف ضرورت سمجھ کر لے آتے ہیں اور پھر فالتو شے کی طرح نکال باہر کرتے ہیں۔ خیر کیا تمھیں یقین ہے کہ تمھارا دوست سچ ہی کہہ رہا ہے؟

اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کاشف میں سے افتخار کو باہر نکالے گی یا پھر افتخار میں موجود کاشف کو شکست دے کر رہے گی۔

ہاں میرا دوست سچ کہہ رہا ہے۔ مجھے اس کا سچ اس کی آنکھوں سے نظر آ گیا تھا۔ اس دن جب یونیورسٹی میں سب پارٹی میں ایک دوسرے کی باتیں سن کر ہنس رہے تھے وہ اس لڑکی کو دیکھ کر رو رہا تھا۔ درد محبت کا پہلا تحفہ ہے جو ہمیشہ وقت پر ملتا ہے۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بھی کتنے تحفے وصول کر چکا ہے۔

وہ لڑکی کیا بہت خوب صورت تھی۔ اس کا جواب سن کر سحرش نے مزید مشکل سوال کر دیا۔

سحرش فاطمہ، اس کی نگاہ میں بس ایک صورت بستی تھی۔ وہی خوب بستی تھی۔ وہ کہتا تھا جب صورتیں محبت کا سانچا اوڑھ کر دل میں بسا کرتی ہیں تو دل جسم کے مکاں کی طرف دیکھنا بھول جاتا ہے۔ شاید وہ جسم سے عاری ہو جاتا ہے۔ تب محبوب کا ان دیکھا وجود، چاہنے والے کے وجود میں بہتے پانی کی طرح قطرہ قطرہ بہتا رہتا ہے۔

یہی اس کی صورت ہوتی ہے اور یہ صورت سب سے خوب ہوتی ہے۔

اس نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا تو سحرش اسے دیکھتی رہ گئی۔

کس کو پڑھ رہے ہو آج کل۔ سقراط کو، افلاطون کو، مارکس کو، کانٹ کو یا کسی اور فلسفی کو۔۔۔

اس نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

خود کو۔۔۔

مختصر جواب نے اس کے سارے ابہام دور کر دیے۔

ھاھاھا، یعنی دریافت کی منزل پر ہو؟

دعا کرو بازیاب کر سکوں۔

اس کے جواب نے اسے مزید حیرت میں ڈال دیا۔

کسے بازیاب کرنا ہے تمھیں؟

سلجھن کو الجھن سے۔۔۔ مشکل جواب نے چیزوں کو پھر سے الجھا دیا۔

جب الجھ الجھ کر کچھ سلجھانے لگو تو بتا دینا۔

اس کے مختصر جواب پر افتخار مسکرا دیا۔

سحرش فاطمہ محبت کرنا ایسے ہی ہے جیسے الجھی ہوئی ڈور میں اس لیے خود کو الجھا لینا کہ اس کی گتھیاں سلجھانی ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ الجھی ہوئی ڈور کے سرے تک الجھ جاتے ہیں اور اسے سلجھانے والا پاگلوں کی طرح خود ان میں الجھ جاتا ہے۔ دعا کرو میرا دوست بھی محبت کی الجھی ڈور سے باہر نکل آئے۔

اس کے لفظوں نے کتنے اندیشوں کو اس کی ذات میں جنم دیا۔ ہاتھ ان دیکھے انداز میں دعا کے لیے اٹھ گئے۔

خدا کرے کہ وہ دوست تم ہو تو سلجھ جاؤ کیوں کہ سلجھے ہوئے الجھ جائیں تو پھر زندگی کی پتنگ تک کٹ جاتی ہے۔ اس نے بے ساختہ ہاتھوں کو دعا کے لیے اٹھایا جب کہ پلکیں نم ہو چکی تھیں۔

☆......☆......☆

زرینہ پچھلے کئی دنوں سے ماں کو خوش کرنے کے لیے وقت پر جاگ رہی تھی۔ وقت پر ناشتہ کرنا، وقت پر دوپہر کا کھانا، اسی طور وطریقے سے رات کا کھانا جیسے ماں کو پسند تھا، اس نے گویا اپنے آپ کو مکمل ماں کی خواہش

کے پیرائے میں ڈھال دیا تھا۔ ماں روز اس کی بلائیں لیتی۔ اگرچہ امارت ان کے در کی باندی بن کر آئی تھی مگر ماں نے بیٹی کا سر کبھی غرور سے جھکنے نہیں دیا تھا۔ اگر چہ وہ شوہر کے اطوار نہیں بدل سکی تھیں مگر اکلوتی بیٹی کی تربیت کرنے میں انہوں نے اپنی پوری توجہ صرف کی تھی۔ وہ جب بھی گھر میں آتی ماں کے ساتھ اکثر کچن میں سالن لازما بناتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ روٹیاں بنانے کی بھی ماہرہ تھی۔ ماں نے شروع سے ہی اسے اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی عادت ڈالی تھی۔ یہاں تک کہ وہ سلائی کڑھائی سمیت اپنے جوتے تک سینا جانتی تھی۔

آج لاہور کا موسم کافی خوشگوار تھا۔ بارش نے ہر چیز کو دھو دیا تھا۔ گھر کے آنگن میں موجود آم سمیت تمام پیڑ دھل کر اجلے اور نکھرے ہو چکے تھے۔ بارش کے بعد چلتی ہواؤں سے شاخیں جھوم جھوم کر اپنی خوشیوں کا اظہار کر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بارش نے پیڑوں پر پاکیزگی کا میک اپ کر دیا ہو۔ لان کی گیلی گھاس میں پاؤں دیے وہ قدرتی مناظر کو دل سے محظوظ ہو رہی تھی۔ کتنا خوب صورت منظر تھا۔

تبھی کافی دیر گیلی گھاس میں پاؤں بھگونے کے بعد وہ بالآخر اٹھی اور کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کیے۔ ملازمہ سے اس نے پہلے ہی چائے اور پکوڑوں کا کہہ دیا تھا۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ کمرے سے نکلی اور ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ درمیانے سائز کا خوب صورت سا کمرہ تھا جہاں چھوٹی سی سینما سکرین جگمگا رہی تھی۔ جب کہ داہنے اور بائیں اطراف دبیز پردوں کے نیچے خوب صورت لائٹنگ اور رنگ برنگے برقی قمقموں کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ چھت سے لٹکتے ہوئے خوبصورت فانوس کمرے کے مالک کی اعلیٰ ذوق کی کھلی داد دے رہے تھے۔ اس نے ملازم کو آواز دی۔ تھوڑی دیر میں اپنی پسند کی مووی لگائی اور پکوڑے اور چائے کے ساتھ فلم دیکھنے لگی۔ اکثر موسم اچھا ہوتا تو وہ کافی، پاپ کارن یا کچھ نہ کچھ لے کر یہاں لازمی فلم دیکھنے آتی۔

یونیورسٹی سے چھٹیاں ہونے کے بعد اس کا معمول تھا کہ ماں کے ساتھ کافی وقت گزارنے کے بعد وہ اپنے لیے بھی وقت لازمی نکالتی تھی۔ دوستوں سے ملنا، رشتے داروں سے ملاقاتیں، پارٹیز، بیڈمنٹن، ٹینس کھیلنا، جم، ادب سے دلچسپی اور اب نیا شوق اس کے دل میں وارد ہوا تھا کہ اکثر اچھے موسم میں کوئی فلم دیکھ لینا۔ اکثر یہ فلم انگلش ہی ہوتی تھی۔ اسے سائنس فکشن اور ہارر موویز دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ فی الحال وہ "لوسی" دیکھ

رہی تھی۔ جس میں ایک لڑکی دماغ کا سو فی صد استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ اگر چہ یہ سائنس فکشن فلم تھی اور اس کی کوئی سائنسی حقیقت بھی موجود نہیں تھی پھر بھی ہدایت کاری، اداکاری اور کہانی میں یہ فلم بالی وڈ کی کافی فلموں سے بہتر تھی۔

ارسلان اور افتخار جب اس کے ساتھ یہاں آتے تو افتخار کی فرمائش پر انڈین فلمیں ہی دیکھتے مگر اسے بذات خود لگتا تھا کہ انگریزی فلمیں نہ صرف ٹیکنیکل لحاظ سے بلکہ موضوعاتی لحاظ سے بھی بہترین ہوتی تھیں۔ کبھی وہ خود کو اسی لڑکی کی جگہ محسوس کرتی جس نے دماغ کے سو فی صد استعمال کے بعد اپنے وجود کو مکمل اپنے بس میں کر لیا تھا۔

فلم دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ انسان دراصل سوچ سے پیدا شدہ مخلوق ہے۔ سوچ انسان کو سب سے ممتاز کرتی ہے۔ اس سوچ کو علم اور آگہی وجدان عطا کرتے ہیں۔ ہماری سوچ جتنی مثبت ہوگی ہمارا رویہ اس سوچ کی غمازی کرے گا اور منفی سوچ رکھنے والا منفی رویے اپنانے میں سب سے آگے ہوگا۔

یہی اس فلم کا مقصد تھا کہ سو فی صد دماغ کے استعمال کا مطلب دراصل سوچ کو اس حد تک لے جانا ہے جہاں انسان اپنے آپ کو اپنے بس میں کر سکے۔ جہاں وہ حقیقتوں کا ادراک کر سکے۔ جہاں وہ اپنی ذات کی پہچان تک پہنچ سکے۔ وہ یہ سمجھ سکے کہ وہ اس کثیر الجہتی دنیا میں کونسا نقطہ ہے اور وہ نقطہ کس لیے ہے اور اس کی رسائی کہاں تک ہے۔

وہ ہمیشہ سے دنیا کو اپنے نظریئے سے دیکھتی آئی تھی۔ اس کے لیے دولت کا مطلب صرف ضرورت پوری کرنا تھا۔ وہ ہمیشہ چاہتی تھی کہ دنیا ایک پرامن اور خوشحال جگہ ہو جہاں انسانیت سب سے مقدم ہو۔ جہاں ہر شخص امید بھری سانسیں لے، عقل کی خوراک کھائے، تمنا کا لباس پہنے اور ادراک کی نیند سوئے مگر جب وہ ہر سو جاری چھوٹی اور بڑی جنگیں دیکھتی تو دکھ اس کے وجود کو سانپ کی طرح ڈسنے لگتے۔ اس نے اتنے عرصے میں یہ جانا تھا کہ انسان سے بڑا وحشی اور ظالم مخلوق شاید ہی کوئی ہو۔ اس دنیا کو تباہی کے دہانے پر پہنچانے والا بھی یہی انسان ہے۔ یہی انسان ہے جو نفرت کی ترویج تو کھلے دل سے کرتا ہے مگر محبت کو فضول جذبہ کہہ کر اسے نفرت اور خود غرضی کے کوڑے دانوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ فلم ختم ہو چکی تھی اور اس کا ذہن سوالات کے پتھر کے نیچے دب

چکا تھا۔

کہیں تھر میں بھوک سے مرتے بچے، جن کو پانی بھی میسر نہیں، جن کے لاغر بدن خوراک کو پکارتے ہیں مگر پانی اور کھانا ان سے کوسوں دور بھاگتا ہے تو کہیں افریقہ میں ایڑھیاں رگڑتے انسان، پوری دنیا میں بھوک کی وجہ سے مرنے والے مظلوم انسان۔۔۔۔ پھر بھی انسان کہتا ہے وہ مہذب ہو گیا ہے۔اس نے ترقی کی ہے۔وہ سوچ رہی تھی کہ آخر انسان نے انسانیت کے معاملے میں کیوں ترقی نہیں کی۔کیوں اس نے احساس کے جذبے کو اپنے وجود میں طاقت سے پھیلنے نہیں دیا۔کیوں خود غرضی کا وائرس اس کے پورے وجود کو نگل گیا۔کبھی کبھی وہ سوچتی تھی کہ آخر ایسا کوئی نظام کیوں نہیں بنتا جو انسانوں کے لیے ہو۔جہاں سب چین کی نیند سو سکیں۔جہاں بندوقوں کے خوف کی بجائے امن کے شادیانے بجتے ہوں۔جہاں امن کی فاختہ کا راج ہو۔شاید ایسا ممکن ہو یا شاید ایسا ناممکن ہو اس نے سوچا اور لائیٹیں بند کر کے وہاں سے نکل آئی۔

☆......☆......☆

دن کے گیارہ بج چکے تھے۔موسم ابر آلود تھا۔نیہا احمد کچن میں بریانی بنانے میں مصروف تھی۔آج وہ خاصی تیاری کر رہی تھی۔اس نے آنٹی سے فرمائش کر کے مارکیٹ سے ایک عدد کھانوں کی کتاب منگوالی تھی۔تبھی ارسلان کچن مین وارد ہوا۔

اس نے ارسلان کی طرف دیکھا۔

شاید ناشتہ کرنے تشریف لائے ہوں گے جناب اس وقت۔اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

جی کیا آپ کو کچھ چاہیے؟ اس نے نرمی سے پوچھا۔

ارسلان آنکھیں مل رہا تھا۔ابھی اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔

میں تو ناشتہ کرنے آیا تھا۔آپ کو کچھ بناتے دیکھا تو قدم رک سے گئے۔پھر سے ماشاءاللہ کس ڈش پر ستم جاری ہے۔ارسلان نے بلاتوقف حملہ کیا تو وہ دل ہی دل میں غصے سے جیسے پھٹ پڑی۔

ستم کیسا؟ کھانا بنا رہی تھی آپ کی طرح دماغ کی دہی نہیں۔

وہ تمام جوابات دل میں سوچتی تھی۔اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ سامنے کہہ دے۔بس اتنا بول سکی۔

کیا آپ کو میں ظالم لگتی ہوں۔

معصومیت سے کہے گئے الفاظ نے ایک دفعہ ارسلان کو چونکا دیا۔

نہیں، آپ نہیں البتہ آپ کے کھانے بہت ظالم ہوتے ہیں۔ پچھلی دفعہ منچورین میں جانے کون سے مصالحے ڈالے تھے کہ تین دن بعد آج کچھ اچھے سے کھانے کے قابل ہوا ہوں۔ ارسلان کے وار پر اس نے دل ہی دل میں اسے برا کہہ دیا۔

عجیب انسان ہے۔ تین دن سے تو لگاتار پہلے سے بھی زیادہ کھاتا آرہا ہے۔ جانے اس سے زیادہ اس نے کیا کھانا تھا۔ شاید کچن کے برتن بھی کھانے تھے محترم نے، وہی نہیں کر سکا یہ۔۔۔

اس نے دل ہی دل میں دوبارہ سوچا اور اسے اسی حالت میں چھوڑ کر بریانی پر توجہ مرکوز کر دی۔

سنئے آج کیا بنا رہی ہیں؟

پھر سے ارسلان کی آواز نے اسے مڑنے پر مجبور کیا۔

آپ نے ناشتہ کیا؟

اس نے بات بدلنے میں عافیت جانی۔

آپ بات بدلنے کی ماہرہ لگتی ہیں۔

ارسلان کی بات سن کر بس وہ مصنوعی مسکراہٹ ہی چہرے پر لا سکی۔

یعنی ناشتہ نہیں کیا آپ نے؟

اس کے دوبارہ استفسار پر اس نے ارسلان کو غور سے اس پر نظریں جماتے دیکھا۔

یہاں کون ہمیں ناشتہ کرواتا ہے۔

ارسلان نے مصنوعی شکوے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا کھائیں گے ناشتے میں؟

یہ بات پوچھ کر وہ مزید مصیبت میں پھنس گئی۔

جی، سری پائے، چکن چنے ایک عدد پوری، ساتھ ایک روغنی نان، ایک کوک اور بعد میں ایک اچھی سی

چائے۔آپ کے ریسٹورنٹ میں یہ ناشتہ ملتا ہے۔

ارسلان کی ڈیمانڈ نے پھر اسے سر پیٹنے پر مجبور کیا۔

سیدھا کہیں کہ انڈا فرائی کھائیں گے۔

اس کے جملے پر ارسلان ہنس پڑا۔

جب آپ کو پتہ ہے تو پوچھ ایسے رہی تھیں جیسے آج آپ نے یہیں چھوٹا ڈھابہ کھول لیا ہو۔

ارسلان کے جواب پر دل ہی دل میں وہ پیچ وتاب کھاتی رہ گئی۔

ڈھابہ کیا ہوتا ہے؟

ھاھاھا وہ مسکرانے لگا۔یعنی اس پورے جملے میں آپ کو ڈھابے نے ہی متاثر کیا۔ڈھابہ فائیو سٹار ہوٹل کو کہتے ہیں۔جو سڑک کے کنارے کہیں بھی نصب ہوتا ہے۔پہلے لوگ ٹین کے ڈبوں سے ہوٹل بناتے تھے۔اس لیے اسے ڈبا ہوٹل کہتے تھے۔بعد میں اس کی شکل بھی ایسے بگڑ گئی جیسے میک اپ صاف ہونے کے بعد لڑکیوں کی بگڑ جاتی ہے۔تب یہ ڈبا سے ڈھابہ بن گیا۔

وہ صرف اوہ کہہ سکی۔حالانکہ ارسلان کی شرارتی نگاہوں سے بھی اس کے جھوٹ تک نہ پہنچ سکی۔یہ بھی نہ جان سکی کہ اس کے ڈھابے کی کہانی بھی اتنی جھوٹی ہے جتنی اس کی اکثر اوقات باتیں ہوتی ہیں۔

ویسے آپ ناشتے کے بارے میں اتنا کیوں متجسس تھیں؟

وہ پھر سے گویا ہوا۔

اب بندہ اخلاقاً بھی کچھ نہ پوچھے؟

اسے اس کی بات قطعی پسند نہ آئی۔

ویسے ہی۔۔۔۔

اس نے پھر مختصر سا جواب دیا اور اس کے لیے انڈا فرائی اور چائے بنانے لگی۔

نا جانے وہ کیا کچھ کہتا رہا مگر اس نے ان سنی کرتے ہوئے فرائی انڈے بنا کر، چائے کے مگ کے ساتھ ارسلان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔کچن کافی بڑا تھا۔لہذا ارسلان کی ماں نے خصوصی طور پر اس کے لیے ٹیبل اور

کرسی کچن میں ہی لگادی تھی۔ وہ جب گھر آتا تو کچن میں ہی ماں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ اور دوپہر کا کھانا کھاتا تھا۔

ویسے بریانی ہی بن رہی ہے نا بعد میں پتہ چلے چاول کا حلوہ بن گیا ہو اور ہم دوپہر کو بریانی حلوہ کھا رہے ہوں۔ حلوہ بنے تو سکون سے اس میں چینی ڈال دیجئے گا۔ ویسے چینی کی بھی قطعی ضرورت نہیں میں نے آج تک نمکین حلوہ کبھی نہیں کھایا۔ آج اسی بہانے نمکین حلوے جیسی سوغات بھی چکھ لوں گا۔ ڈش تو منفرد ہے مگر اس انفرادیت میں اس کی ہیئت بدل جائے گی جیسے شادی کے بعد لڑکی تو وہی رہتی ہے مگر اس کی ہیئت بدل جاتی ہے۔

کھانا کھاتے وقت بھی اسے بولتے دیکھ کر وہ سر پیٹ کر ہی رہ گئی۔

آپ کو شادی کے بعد لڑکیوں کی ہر حالت کا پتہ ہے۔ کتنی شادیاں کر چکے ہیں؟

جواب سن کر ارسلان نے خاصا اونچا قہقہہ لگایا تھا۔

جب سے آپ نے کھانے بنانے شروع کیے ہیں۔ مجھے کم از کم بدمزہ کھانے کا اچھی طرح سے علم ہو گیا ہے۔

کتنا فضول بولتا رہتا ہے یہ انسان، کسی بھی بات کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر۔ بس بے تکان اپنی گردان جاری رکھے رہتا ہے۔ اس کے لفظوں سے اگلے کو کتنی ٹھیس پہنچتی ہے سوچتا بھی نہیں۔ اس نے اذیت سے دل میں سوچا۔ اسے لگتا ہے میں بے سلیقہ لڑکی ہوں جسے کچھ بھی پکانا نہیں آتا۔ شاید مجھے کسی نوکر کی طرح سمجھتا ہو۔ مجبوری انسان کو کسی کا نوکر بھی بنا دیتی ہے۔ بلکہ نوکر بھی نہیں سمجھتا۔ نوکروں کو بھی کھانا تو ڈھنگ کا بنانا آتا ہے۔ اس کی طنزیہ باتیں اور رویئے مجھے کسی صورت احساس نہیں دلاتیں کہ یہ مجھے عزت کے قابل ہستی سمجھتا ہے۔ اس نے ملال کے ساتھ سوچا۔ اس کے متعلق کتنی غلط فہمیاں دل میں پال چکی تھی۔

تبھی اس کی آواز نے پھر سے چونکا دیا۔

محترمہ، آپ کی بریانی بن جائے تو مجھے آواز نہ دیجئے گا۔

کیوں؟ اس نے کاٹ دار طریقے سے کہا۔

کیونکہ مجھے باہر جانا ہے آج دوستوں کے ہاں دعوت ہے۔ ویسے بھی میں حلوہ بریانی نہیں کھاتا۔

ہونہہ، دوستوں کے ہاں، مرد بھی کتنا سر پھرا ہے۔ گھر میں عزت کے ساتھ جتنا مرضی کھانا دو پھر بھی باہر کے بدمزہ کھابوں کو تعریفوں کے ساتھ کھائے گا۔

وہ کہہ نہ سکی۔ بس اتنا ہی کہہ سکی۔ جیسے آپ کی مرضی۔

اذیت اپنی انتہا پر تھی۔

امی آئے تو کہہ دیجئے گا میں نے گیارہ بجے بریانی کھالی تھی ورنہ وہ غصہ کریں گی۔

جی میں جھوٹ نہیں بولتی۔

بالاخراس نے اپنے غصے کا اظہار کر ہی دیا۔ غصے کے اظہار کے بعد شاید وہ تھوڑی سی مطمئن بھی ہوگئی تھی۔

کوئی بات نہیں۔ کون سا روز بولیں گی۔ دیکھیں ان کو لگتا ہے کہ ارسلان کو گھر کی چیزیں ہی کھانی چاہئیں۔ باہر کا کچھ کھالوں گا تو بیمار پڑ جاؤں گا۔

آنٹی سچ کہتی ہیں ارسلان صاحب۔

جانے کتنے تکلفات تھے جو ایک دم در آئے تھے۔ وہ پھر سے صاحب ہوگیا تھا۔ اس کے جملوں نے شناسائی کی اس ہلکی لہر کو بھی ختم کردیا تھا جو اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔

ارسلان صاحب! اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

نیہا احمد، ارسلان ابھی صاحب کی منزل تک نہیں پہنچا نہ ہی پہنچنا چاہتا ہے۔ صاحب کے رتبے پر رہنا ایسے ہی ہے جیسے شدید گرمی میں سب سے بالائی منزل پر بغیر بجلی کے رہنا۔ آپ مجھے سب کچھ کہہ لیں مگر صاحب مت کہا کریں۔ میں آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ اس مصنوعی خول سے باہر نکلیں۔ آپ کو میرے جملے سخت بھی لگتے ہوں گے۔ آپ کو کبھی میری باتیں بری بھی لگتی ہوں گی مگر یہ سب اسی لیے کرتا ہوں کہ آپ موم کی گڑیا کی طرح خاموش نہ بیٹھیں۔ اپنے بھرپور ردعمل کا اظہار کریں۔

اس کے لفظوں نے پھر سے اس کے وجود پر سکون کی اوس گرادی۔ پل بھر میں وہ بدل جاتا تھا۔

ویسے آپ کس قسم کے خول کی باتیں کررہے ہیں؟

ویسا ہی جیسا انڈے کا ہوتا ہے جو ابھی آپ نے فرائی کیا ہے۔ ساری کائنات اسی انڈے کے اندر ہوتی ہے

مگر خول سے نہیں لگتا کہ اصل زندگی اندر ہوگی۔آپ نے بھی اپنے اوپر وہی خول چڑھا رکھا ہے اداس لڑکی کا۔ اپنے اندر موجود نیہا کو باہر نکال لیے۔پھر دیکھیئے کیسے آپ مرغی کی طرح آزادی کے ساتھ پروں کو پھڑ پھڑا کر دنیا بساتی ہیں۔

ارسلان کے جملوں نے پھر سے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

کچھ تو تھا جو اسے وہ اپنا سا لگنے لگا تھا۔ایکدم اس کا غصہ انتہا پر پہنچ جاتا تھا اور دوسرے لمحے اس کا کوئی جملہ اسے بالکل پرسکون کر دیتا تھا۔

جی میں ایسی ہی ہوں۔

اس نے ہمت کرتے ہوئے نیہا کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔

آپ ایسی ہی کیوں ہیں؟ یہی میرا سوال ہے؟

اس کے سوال نے پھر اسے سٹپٹا دیا تھا۔بچپن سے دکھوں کی کوکھ میں پلی بڑھی تھی۔ایک دفعہ دل چاہا کہ اسے کہہ دے کہ ارسلان میاں تم اپنے گھر میں محفوظ چھت کے نیچے اتنی اٹھکیلیاں کرتے ہو کبھی زندگی کو قریب سے دیکھو تو علم ہوگا کہ زندگی قریب آنے والوں کو تحفے میں دکھ اور غم کی سوغاتیں دے کر روانہ کرتی ہے۔

پتہ نہیں ایسی کیوں ہوں۔شروع سے ہی ایسی ہوں۔کیا آپ کو ایسی نیہا بری لگتی ہے؟

معصومانہ انداز میں پوچھے سوال کا جواب وہ ارسلان کی آنکھوں میں نہ ڈھونڈ سکی۔

آپ کہیئے آپ امی سے کہیں گی یا نہیں۔

مجھے کہتا تھا میں موضوع بدلنے میں ماہر ہوں یہ تو مجھ سے زیادہ ہی شاطر نکلا۔

اس نے دل میں سوچا۔

ارسلان کے سوال نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔وہ جھوٹ نہیں بولتی تھی مگر دل کہہ رہا تھا کہ اس کے لیے ایک جھوٹ بولا جائے۔صرف ایک جھوٹ۔۔۔۔۔۔

بالآخر اس نے دل کی مان لی اور ہاں کہہ دیا۔

جانے کتنے دل کے حجاب تھے جو اس جی نے دور کرے تھے۔اسے لگ رہا تھا جو کچھ دیر پہلے سب سے اجنبی

تھا اس نے دل کی سیڑھی کو چپکے سے تھام کر اس کے سچ تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

بریانی بناتے بناتے اسے بھی اپنا مت بنا لینا۔

جانے اندر سے سلگتی لڑکی کی آواز ابھری اور مایوسی کی چادر پہن کر پھر سے وہ اپنے کام میں جت گئی۔ زندگی اسے پل بھر میں خوشی دے کر اگلے لمحے غم کی دہلیز پر پٹک دیتی تھی۔

☆......☆......☆

گل پھپھو، گل پھپھو کیا ہوا؟

وہ اچانک خوف سے اٹھ گئیں۔ سامنے دیکھا تو سحرش گھبرائے انداز میں کھڑی تھی۔

کیا ہوا پھپھو؟ آپ چلا رہی تھیں۔ کیا نیند میں ڈر گئیں تھیں۔ میں ادھر سے گزر رہی تھی کہ اچانک آپ کو چلاتے دیکھا لہذا کمرے میں آئی۔ شاید آپ نیند میں ڈر گئی تھیں۔

بیٹا ذرا پانی پلا دو۔ انہوں نے گھبراہٹ کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

جی پھپھو۔ تھوڑی دیر میں وہ پانی لے آئی۔

وہ غٹا غٹ پانی پی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں سکون محسوس ہونے لگا۔

معافی چاہتی ہوں بیٹا! تمہیں تکلیف دی۔ انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تو اس کا دل پسیج گیا۔

پھپھو آپ ہمیشہ ہی غیروں جیسی باتیں کرتی ہیں۔

اس کا شکوہ سن کر وہ مسکرا دیں۔

بیٹا اپنا بننا تو بہت آسان ہے۔ بس پیدا ہو گئے اپنا بن گئے۔ مشکل تو غیر بننا ہے۔ کسی کو تکلیف دینی ہے۔ کسی کے ساتھ بے حسی سے پیش آنا ہے۔ کسی سے نفرت کرنی ہے۔ احترام ختم کر دینا ہے۔ انسان اپنی انسانیت کو مار کر ہی غیر بنتا ہے اور میں نے کبھی اپنی بیٹی کو غیر نہیں سمجھا۔ لہذا میرے لیے اپنا بننے سے غیر بننا زیادہ مشکل ہوگا۔ انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

ہاتھ تھامتے ہوئے انہیں محسوس ہوتا تھا جیسے افتخار کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہو۔ تبھی انہیں افتخار کا خیال بری طرح ستانے لگا۔

افتخار کہاں ہے؟

وہ یہاں کہاں ہوتا ہے پھپھو۔

اس کے جواب پر وہ لمبی سی آہ کر گئیں۔ سچ ہی تو کہتی تھی وہ یہاں کہاں ہوتا تھا۔

عجیب سا لڑکا ہے۔ دل میں ہول اٹھتے ہیں۔ جانے کس دیس کی مٹی کھا کر آیا ہے کہ اپنے دیس کا چاند بھی اس کے دل کو نہیں بھا رہا۔

انہوں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا تو اداسی جیسے اس کے چہرے پر چھا گئی۔

کبھی سوچتی ہوں کہ جس طرح یہ آیا ہے اگر اسی طرح گیا تو جانے اگلی دفعہ کس حالت میں ملے۔ تم سے بھی کچھ نہیں کہتا کیا؟ انہوں نے سحرش سے اس امید پر پوچھا کہ شاید اسے کچھ علم ہو۔

پھپھو جب سے آیا ہے تب سے ٹیلے پر سرد رویے میں لپٹے ایک شخص کو دیکھا ہے۔ آپ جسے اپنا افتخار کہتی تھیں نا وہ فخر کو لاہور چھوڑ آیا ہے پھپھو۔ روز تھرماس بھر کر چائے لے جاتا ہے۔ جب آتا ہے تو چائے کے ساتھ خود بھی ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ شاید اسے کوئی روگ لگ گیا ہے اور ٹیلے پر مٹی میں اس روگ کو چائے کے ساتھ مل کر دفن کرنے جاتا ہے۔

اس کے جواب نے ان کے دل کو مزید کمزور کر دیا۔

جانتی ہو۔ میرا دل پہلے ہی کمزور ہے۔ ابھی خواب میں بھی اسے ہی دیکھا تھا۔ اسی ٹیلے سے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بیٹا میں سچ میں ڈر گئی ہوں۔ پتہ نہیں مگر لگتا ہے افتخار کو افتخار کا جسم گھسیٹتے ہوئے ماں کے پاس لایا ہے۔ میرا افتخار تو لاہور کے دھوئیں میں کہیں کھو گیا ہے۔

ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ابھی خواب میں انہوں نے اسے ٹیلے سے کود کر جان دیتے دیکھا تھا۔ وہ کتنا ڈر گئی تھیں۔ ایک وہی تھا جس کی وجہ سے وہ جیتی تھیں۔

پھپھو آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت لگے گا۔ میں بھی دعا کرتی ہوں۔ آپ بھی کریں۔

وہ کتنے غور اور محبت سے اس سنہرے بالوں والی خوب صورت پری کو دیکھ رہی تھیں۔ افتخار ہمیشہ سے انہیں اس کی آنکھوں میں نظر آیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ افتخار سحرش کی زندگی میں سحر بن کر آئے۔

ویسے ابھی تک نہیں پہنچا کیا؟ پھر سے وہیں گیا ہوگا۔

انہوں نے تکلیف دہ طریقے سے پھر دریافت کیا۔وہ جانتی تھیں کہ وہ ٹیلے پر مٹی میں وجود کو ملا چکا ہے۔

آپ مت گھبرائیں آجائے گا۔اس نے تسلی دی تو وہ بس اذیت بھری مسکان ہی چہرے پر ابھار سکیں۔

بیٹا میں ڈرگئی ہوں۔میرا افتخار ماں کو ڈرا گیا ہے۔وہ ٹیلے پر مٹی میں ماں کی قبر بنا رہا ہے۔اسے کہو ماں کو اتنا نہ ستائے کہ پھر وہ اس کی صدا کو بھی ترسے۔

جانے کتنے دن کے شکوے تھے۔کتنا دکھ تھا جو آج پورے دکھ کے ساتھ آنسوؤں سے بہتا جا رہا تھا۔

سحرش نے انہیں بانہوں میں لے لیا۔ان کی آنکھوں سے آنسو بری طرح بہہ رہے تھے۔دل بیٹے کے غم میں گھائل ہو رہا تھا۔بچپن سے لے کر ٹانگوں سے محروم ہونے تک انہوں نے ہر قسم کی اذیتیں برداشت کی تھیں۔وہ بہت بہادر تھیں مگر ان کے لاڈلے بیٹے نے انہیں انہی کے سامنے کمزور کر دیا تھا۔

پھپھو وہ آئے تو خوب ڈانٹیں مگر خدا کے لیے خود کو اذیت مت دیں۔آپ کتنا سہہ چکی ہیں۔اب کسی کے لیے کیوں سہیں گی۔بھلے وہ افتخار ہی کیوں نہ ہو۔بس آپ اب نہیں روئیں گی۔

وہ لڑکی جس کی آنکھیں نم تھیں وہ ان کی نگاہوں سے بہتے آنسوؤں کو ہاتھوں میں اٹھا کر کسی مقدس شے کی طرح ان کے چہرے پر تسلی بکھیر رہی تھی۔محبت صرف محبوب سے نہیں ہوتی بلکہ محبت شاید محبوب سے منسلک ہر شے سے ہو جاتی ہے۔انہوں نے غور سے افتخار کی یادیں دماغ میں پالتی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور جانے کتنی دعائیں بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس کے لیے کر ڈالی۔

☆......☆......☆

کبھی کبھی ایسے بھی گماں ہوتا کہ کوئی آہستہ سے جسم میں اتر رہا ہو۔کبھی کبھی ایسا بھی لگتا ہے جیسے کوئی اپنا سا لگنے لگا ہو۔کسی کی باتیں سب سے اچھی لگتی ہوں۔کسی کا انداز دل میں اتر جاتا ہو۔کسی کے الفاظ موتی سے اچھے لگتے ہوں۔کسی کے مسکراتے چہرے کو دیر تک رک کر دیکھنے کو دل کرے۔

کبھی یوں بھی لگتا ہے جیسے درد روح میں شدت کے ساتھ ابھرے تو اسے سوچ کر تھوڑی دیر سکون کی گلی میں گھوما جائے۔جیسے شدید رنج والم میں وہ "مجھے محسوس کرو" کی صدا لے کر جسم میں ابھرے۔وہ ابھرے تو امید

آنکھوں میں جگنو کی طرح جگمگا اٹھے۔وہ ابھرے تو آنکھوں کا پانی دل کو چیرنا بند کر دے۔وہ دل میں کسی لہر کی طرح ابھرے تو وجود خلوص کے سمندر میں بلاوجہ غوطہ زن ہو جائے۔

نیہا احمد، تمھیں کیا ہوتا جارہا ہے۔تم اسے سوچ رہی ہو جو تمھاری سوچ سے اتنا ہی پرے ہے جتنا اعتماد تمھاری ذات سے دور ہے۔تم صحیح نہیں کر رہی ہو۔اس کی طرف سے التفات کے چند جملے کاسہ دل میں پا کر تم خود کو محبت کی سلطنت کی ملکہ سمجھنے لگی ہو۔لوٹ آؤ لڑکی، ہجر کی تلخ راتیں شدید دشوار گزار ہوتی ہیں۔تم سہہ نہیں پاؤ گی۔

شیشے میں اپنے عکس سے جانے کب سے وہ باتیں کر رہی تھی۔اسے لگ رہا تھا جیسے ارسلان بنا بتائے مہمان کی طرح اس کے دل کا مہمان بنتا جارہا ہے۔اس نے زندگی میں رشتوں میں صرف نفرت دیکھی تھی آج محبت کا رشتہ بنانا چاہا تو اندر بیٹھی نیہا نے اسے ڈانٹ پلادی۔

نیہا احمد! محبت شاخ پر اگنے والا کوئی پھل نہیں کہ جب دل چاہا توڑ لیا اور کھالیا۔سنو! وہ تم سے ہمدردی کرتا ہے۔وہ تم پر رحم کرتا ہے۔تم اس کی ہمدردی کو محبت سمجھ بیٹھی ہو۔محبت کبھی ہمدردی کے ورق میں لپیٹ کر کسی کے سامنے نہیں رکھی جاتی۔جس سے ہمدردی ہوتی ہے اس کا صرف دکھ ہی اپنا لگنے لگتا ہے جب کہ محبت میں وہی شخص پورے کا پورا اپنا لگتا ہے۔یہی فرق ہے تمھاری نئی کھلتی محبت اور اس کی روز بڑھتی ہمدردی میں کہ وہ ہمدردی کو لفظوں کی مالا پہنا کر تمھارے سامنے لے آتا ہے اور تم کاسہ دل لے کر اس کے در پر محبت کی بھیک مانگنے چلی جاتی ہو۔

نہیں۔میں نے کبھی نہیں کہا مجھے اس سے محبت ہے۔وہ اچھا انسان ہے۔اچھے انسان احترام کے قابل ہوتے ہیں۔اس نے اپنی ذات پر چلاتے ہوئے کہا۔ہمیشہ اندر بیٹھی نیہا باہر بیٹھی نیہا سے لڑتی رہی تھی۔

جانتی ہو ارسلان کہتا ہے میں تمھیں باہر نکالوں۔

اس نے سر پکڑ لیا اور دھیرے سے کرسی پر بیٹھ گئی۔تمھیں۔۔۔آنکھیں بند کر کے خود سے مخاطب ہوئی۔

اسے بتا دوں نا کہ تم دل میں بیٹھ کر اس سے دور ہونے کا مشورہ دیتی رہتی ہو تو شاید وہ تم سے ہی نفرت کر بیٹھے۔وہ مجھے کہتا ہے میں اپنے اندر اعتماد پیدا کروں اور تم مجھے ہارا ہوا کھلاڑی بنانا چاہتی ہو۔

اس نے اپنے آپ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

وجود کی لڑائی سب سے مشکل لڑائی ہوتی ہے۔اس میں انسان اس شخص سے ہار جاتا ہے جس کے لیے وہ ساری دنیا سے جیتنا چاہتا ہے۔وجود کی لڑائی میں یا تو انسان دوسرے شخص کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے یا اسے اپنی ذات میں ڈھال لیتا ہے۔

نیہا نے خود سے لڑنے کا آغاز کر دیا تھا۔اپنی ذات میں بیٹھی ڈرپوک نیہا سے لڑ رہی تھی جس نے ہمیشہ ہر چیز کا منفی رخ ہی دیکھا تھا۔پہلی دفعہ نیہا احمد، نیہا احمد کو دلیلیں دے رہی تھی اور پہلی دفعہ اندر بیٹھی نیہا احمد باہر کی نیہا احمد کو حیرت سے تک رہی تھی جس نے ہمیشہ اس کی آواز پر سر تسلیم خم کیا تھا آج وہ پہلی بار بغاوت کر رہی تھی۔پہلی بار لڑ رہی تھی اور اس کی پہلی لڑائی بھی کسی اجنبی کی خاطر برسوں سے شناسا نیہا سے ہی ہو رہی تھی۔

نیہا احمد تم گڑھے میں گر جاؤ گی۔تمھیں کوئی اٹھانے والا نہیں ہوگا۔دیکھو دل کو جب چیرا جاتا ہے نا تو اس میں سے خون کے ساتھ احساسات بھی باہر نکلتے ہیں۔جس راستے پر تم چل رہی ہو وہاں ہجر کی تلخیاں ہیں۔وہاں موت سی تھکن رقص کر رہی ہے۔تمھیں ناامیدی کے گھوڑے پر سوار ہو کر امید کی وادی میں پہنچنا ہوگا سوچو کل وہ کہہ دے کہ نیہا احمد میرا دل اتنا سستا نہیں کہ تم سما جاؤ۔جاؤ میری دنیا میں تمھارے لیے جگہ نہیں تب تم کیسے سامنا کرو گی۔کہاں جاؤ گی۔

وہ گھبرا گئی۔فوراً اٹھ گئی۔جب کہ اندر بیٹھی نیہا فاتحانہ مسکراہٹ کیساتھ اسے تسلی دے رہی تھی۔

محبت میں گھبرانے سے ابھی گھبرانا بہتر ہے۔ابھی گھبراؤ گی تو پانی پی کر اور خود کو تسلی دے کر مطمئن ہو جاؤ گی مگر محبت کے خواب سے ڈر کر اٹھو گی تو وہاں صرف ہجر کا پانی ہوگا جو تمھیں پینا ہوگا۔تب تم تپتے صحرا میں تڑپتے مسافر کی طرح محبت کے ہاتھوں دم توڑ جاؤ گی۔

وہ کمرے سے ملحقہ واش روم میں گئی۔کتنی دیر اپنے سر کو سنک کے نیچے دیئے رکھا۔پانی شدت کے ساتھ اس کے بالوں سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ گھبرا گئی تھی۔اسے اپنی ذات سے لڑنے کا تجربہ نہیں تھا۔پہلی لڑائی ہمیشہ طاقتور جیتتا ہے۔آج کی لڑائی میں اسے بری طرح شکست ہو گئی تھی۔دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں کسی سے رشتہ قائم کر لیں تو اسے اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔پھر اس شخص کا مسکرانا بھی دکھوں کو اچھا نہیں لگتا۔اس نے بھی سکھ سے

دوستی کرنے کی کوشش کی تھی اور محبت کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا تبھی دکھوں نے زور سے اسے اپنی دنیا میں واپس دھکا دے دیا۔ محبت کی زیر تعمیر دیوار چپکے سے لمحے میں ہی ڈھ گئی اور اسے دور دور تک صرف ریت نظر آنے لگی۔

نیہا، آج نیہا سے ہار گئی تھی۔

☆......☆......☆

سحرش اتنا جان گئی تھی کہ جو دیر سے لوٹتا ہے وہ دراصل گھر لوٹنا نہیں چاہتا۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بار اس سے پوچھ لے کہ ایسا کون سا سوال ہے جسے پوچھنے کے بعد اسے اس کے سوالوں کا جواب ملے گا۔ شام ڈھل چکی تھی اور وہ مضمحل ہو کر گھر لوٹ آیا تھا۔

افتخار تم پرندوں جیسے ہو گئے ہو۔ اب صرف رات کو ہی لوٹتے ہو۔

اس نے افتخار کے کمرے میں داخل ہوتے اسے دیکھ کر کہا۔

افتخار اس کی بات پر مسکرا رہا تھا۔ جب کہ گل بی بی دوسرے کمرے میں سو رہی تھیں۔

ایسی بھی کوئی بات نہیں۔

ہمیشہ کی طرح جھوٹ بول کر اس نے پھر سے فیصلہ کر دیا کہ وہ زبان نہیں کھولے گا۔

کچھ ڈھونڈ رہے ہو ان وادیوں میں یا پھر اسی ٹیلے پر کچھ چھپا آئے ہو جسے روز دیکھنے جاتے ہو۔

جس نے کتنے دنوں سے سب کی ناک میں دم کیا ہوا تھا سحرش نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سے سب کچھ اگلوا کر ہی دم لے گی۔

نہیں سحرش۔۔۔ تم اور امی ہمیشہ ایسا کیوں سوچتے ہو۔ سو قسم کے مسائل ہوتے ہیں۔

افتخار کے جواب پر وہ ہنس پڑی۔

افتی جی سو مسائل تو نظر آتے ہیں مگر آپ پھر بھی ہمیں ڈھونڈنے سے نظر نہیں آتے۔

اس کے جواب پر وہ بھی مسکرا دیا۔

میں انہی مسئلوں میں کہیں دفن ہو گیا ہوں۔ اس کے جواب نے اس کے دل کو اداس کر دیا۔

اور مجھے نہیں لگتا کہ تم وہاں سے باہر نکلنا چاہتے ہو۔ کیا وہیں بسنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

قبرستان میں مرضی سے نہیں جاتے۔ جو دفن ہوتے ہیں انہیں اپنے ہی تو دفنا کر آتے ہیں۔

افتی کے جواب سے اسے قدرے غصہ آنے لگا۔

توبہ کرو افتی۔ مسئلوں کو دفن کیا جاتا ہے خود ان کے نیچے دفن نہیں ہوا کرتے۔ جو بزدل ہوتے ہیں وہی ایسا کرتے ہیں۔ جب کہ تم ایک بہادر لڑکے تھے۔

اس نے غصہ کرتے ہوئے کہا۔

تھا اور ہے میں کافی فرق ہوتا ہے سحرش۔ امی کو کہا تھا جو میں تھا وہ میں نہیں ہوں۔ لہذا مجھے وہاں نہ ڈھونڈیں جہاں میں تھا۔ تم بھی اسی افتخار کو ڈھونڈتی ہو جو کبھی تھا۔ لیکن تم بھول گئی ہو کہ وہ افتخار تھا اور یہ افتخار ہے۔

اس کے جواب نے اسے مزید الجھا دیا۔ جانے ٹیلے نے کون سا سایہ کر دیا تھا اس لڑکے پر جو ہونے اور نہ ہونے پر الجھ رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا۔

مگر اپنے ہونے کو ہونے والوں کے لیے تو قابل احترام بنا دو۔ تم یہاں ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتے۔ دن کو ٹیلے پر رہتے ہو اور رات کو دیوانوں جیسی باتیں کر کے پھر سے اگلے دن ٹیلے پر رہنے کے لیے چلے جاتے ہو۔

ھاھاھا، اس کے جواب پر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

کہیں تم لوگوں کو تو یہ نہیں لگ رہا کہ کشمیر کی وادی میں ایک مجنوں پیدا ہو چکا ہے۔ جیسے ٹیلے پر کسی نئی محبت کے پیڑ نے جنم لیا ہے۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا مگر وہ بالکل بھی خوش نہیں ہوئی۔

نہیں افتی! البتہ ہمیں یہ لگنے لگا ہے ایک مجنوں ٹیلے پر مسلسل رہتے ہوئے جانے کتنی کہانیاں جنم دے رہا ہے۔ وہ مجنوں کشمیر میں پیدا نہیں ہوا البتہ کشمیر میں اس کا جنوں جوان ضرور ہو رہا ہے۔

اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

آج لگتا ہے میرے خلاف ہی تلوار لے کر بیٹھی ہو۔ کاٹنے کا ارادہ ہے یا کٹے ہوئے افتخار کو دیکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس نے بھی اسی کے انداز میں ہی جواب دیا تھا۔

میرے ہاتھ میں دوستی کا قلم ہے۔مگر ڈرو ایک ماں سے کہ اس کے ہاتھ میں صبر کی تلوار تم نہیں دیکھ پا رہے۔

افتی! ماں صبر کی تلوار سے روز اپنا کلیجہ چیرتی ہے۔روزان راہوں کو جہاں سے تم آتے ہو ایک ماں دل کو چیر کر انہی راستوں میں بچھا دیتی ہے مگر تم کچھ دیکھ ہی کہاں پا رہے ہو۔

اس نے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا تو ایک لمحے افتخار کے ماتھے پر بھی شکن آ گئے۔

چھوٹا سا نفیس سا کمرہ جہاں افتخار پہلے رہتا تھا۔اس کی چھوٹی سی الماری جہاں کتابیں اور یادیں دونوں نے بری طرح بسیرا کیا ہوا تھا اب کتابوں سے زیادہ سحرش اور اس کی ماں کو وہاں سے یادیں نکلتی محسوس ہوتی تھیں۔ ایک گھومنے والی کرسی جہاں افتخار کبھی بیٹھ کر سحرش کو دوستی کے خطوط لکھا کرتا تھا۔ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے والے خطوط۔۔۔

جس پر میری اچھی دوست سحرش۔۔۔سب سے اوپر اور نیچے چند بے ہنگم لائنز اور جملے اور آخر میں فقط آپکا تابعدار افتخار لکھا ہوتا تھا۔

سب مناظر روز سحرش کی آنکھوں میں موتی بھر دیتے تھے۔سامنے مہین پردوں کے پیچھے چھپی کھڑکی جہاں سے باہر اونچے پھل دار اور چنار کے درخت نظر آتے تھے اور افتخار پردے ہٹا کر جانے گمشدہ راہوں پر کیا ڈھونڈتا رہتا تھا۔وہ اسی کھڑکی سے روز اس کے آنے اور جانے والی راہ کی اڑتی مٹی سے ڈھیروں باتیں کیا کرتی تھی۔مگر اس وقت اس راہ پر صرف مٹی ہی مٹی تھی۔

سحرش! کہاں کھو گئی ہو؟

افتخار کی آواز سے وہ دوبارہ کمرے میں لوٹ آئی۔

سوچ رہی تھی کہ اگر وہیں خود کو کھو دیا جہاں تم کھوئے ہوئے ہو تو کیا آنٹی اور میں تمھیں پالیں گے۔

اس نے افتخار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

افتخار! وہ پھر سے گویا ہوئی۔

راستوں میں انسان کہاں ملتے ہیں۔وہاں تو صرف دھول ہوتی ہے۔کھلی کھڑکیوں سے چلتے انسانوں کے نشان تو مل سکتے ہیں مگر انسان نہیں افتی!

اس کی بات سے افتخار کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ تبھی ایک دفعہ مڑ کر اس نے سحرش کی طرف دیکھا۔

انف یہی نگاہیں تھیں جس نے اسے ہر نگاہ سے دور کر دیا تھا۔ یہ انداز تھا جس نے اسے ہر انداز سے لاتعلق بنا دیا تھا۔ محبت کی یہ نگاہ اسے شفق سے پھوٹتے ہوئے سورج کی پہلی کرن جیسی لگتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے خود کو انہی نگاہوں میں ڈوبتا محسوس کرتی تھی۔

سحرش نے جانے کتنی دیر اس کی نگاہوں کی تپش کو اپنے وجود کے اندر محسوس کیا۔

سحرش! اتنی بڑی کب سے ہوگئی ہو۔

اس کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آئی۔

جب سے تم ہمارے لیے چھوٹے ہو گئے ہو۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا جب کہ اس کی مسکراہٹ میں بھی کتنا کرب تھا۔

تبھی وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

افتخار تم مجھ سے اتنے بے خبر رہے کہ میری عمر کی پختگی کا اندازہ تمھیں میرے لفظوں کی شدت کے راستے سے آ کر کرنا پڑا۔ افتخار اپنوں سے اتنا بے خبر بھی نہیں ہونا چاہئیے کہ زندگی موت کے تعاقب میں بھاگتی ہوئی کوئی شے لگنے لگے۔

اس کے چہرے پر تاسف کی لکیریں نمودار ہو رہی تھیں۔

مجھے نہیں پتہ تھا کہ میرے نہ ہونے کا درد اتنا بڑھ جائے گا کہ گھر کی دیواریں بھی رونے لگیں گی۔ میں ہمیشہ سے ماں کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ انہیں دنیا کی ساری خوشیاں دینا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ان کی زندگی میں چاہتوں اور محبتوں کے پھول چن چن کر لاؤں۔ ان کے قدموں میں امید کے پھولوں کو نچھاور کروں۔ ان کے چہرے پر ذرا سی تکلیف دیکھتا تو ہمیشہ درد اپنے سینے میں محسوس کرتا۔ میں یہ بھی نہ جان سکا کہ میری ایک اچھی سی دوست ہوا کرتی تھی جسے میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے چپکے سے خط لکھا کرتا تھا وہ اتنی بڑی ہوگئی کہ زندگی اور افتخار دونوں اسے چھوٹے لگنے لگے۔ کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والی دھول کو بھی پہچاننے کی اس میں صلاحیت آگئی۔ تم سچ کہتی ہو میں بدل گیا ہوں مگر امید رکھو سب سے پہلے تمھیں بتاؤں گا مگر تم ایک وعدہ کرو گی۔

افتخار نے پر امید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس لمحے اسے کتنا اچھا لگا جب افقی نے اس سے کسی چیز کی فرمائش کی۔ بھلے وہ کوئی وعدہ ہی کیوں نہ ہو۔

ہاں افقی! تسلی رکھو۔ یہی سوچو کہ تم اپنے ہمزاد کو بتا رہے ہو۔

اس کی بات پر افقی مسکرا دیا۔

تمھیں وعدہ کرنا ہوگا کہ جب تک میں تم سے کچھ نہیں کہہ دیتا تم امی کو میری طرف سے تسلی دوگی ان کو یقین دلاؤ گی کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ افقی آج بھی ان کا وہی معصوم بیٹا ہے جو پہلے دن تھا۔ کہو میری خاطر ایسا کروگی۔

جانے کتنی امید سے وہ اسے دیکھ رہا تھا اور وہ تک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ مان اور بھروسے کی اس سے بڑی کیا مثال ہوگی کہ افقی اسے دل کی بات بتانے جا رہا تھا۔ بھلے دیر سے ہی سہی اور اس سے وعدہ لے رہا تھا کہ وہ ماں کو پھر سے ماں بنا دے۔ خوش رہنے والی ماں۔۔۔۔۔

ٹھیک ہے افقی! تم تسلی رکھو۔ میرے دل کو بھی اب تسلی ہوگئی ہے۔

اس کے جواب سے مطمئن ہو کر افقی کرسی پر بیٹھ کر کسی کتاب پر جھک گیا جب کہ وہ اس کے الفاظوں کے سحر میں ہی کھوئی رہی۔



صبح کتنی حسین ہوتی ہے خاص کر آج کی صبح، وہ صبح سویرے گھر سے کافی دور ایک دارالامان میں آئی تھی۔ وہ جب بھی گھر آتی تھی این جی اوز کے ساتھ مل کر لازمی مختلف علاقوں کا دورہ کرتی تھی۔ این جی او چلانے والی خاتون اس کی ماں کی بہت اچھی دوستوں میں سے ایک تھیں۔ یہ این جی او مختلف شہروں میں دارلامان، یتیم خانے سمیت دماغی امراض میں مبتلا افراد کے لیے دیکھ بھال کے مراکز چلا رہا تھا۔

دارالامان میں کافی تعداد میں گھروں اور رشتوں سے محروم خواتین قیام پذیر تھیں۔ ہر کسی کی الگ دکھ بھری داستان تھی۔ کسی کو دولت کی کمی نے غربت کے دھانے پر پہنچایا تھا اور کسی کو رشتوں کی بے اعتنائیوں نے در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا تھا۔ انہی حالات کو دیکھ کر وہ دن بدن عملی طور پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ دن بدن وہ

محبت کو سب سے بے اہمیت جذبہ سمجھتی جارہی تھی۔ یہاں ہزاروں لڑکیوں کی ہزاروں کہانیاں دفن تھیں اور اکثر محبت کے دھوکے کا جام پی کر یہاں پہنچی تھیں۔

وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کے قصے سنتی۔انہیں تسلیاں دیتی۔

دنیا ایک کہانی گھر ہے۔ یہاں زندگی کے مختلف موڑ ہیں اور ہر موڑ پر ایک نئی کہانی منتظر رہتی ہے۔دارالامان کے باغیچے میں چند خوب صورت سرخ پھولوں کو مرجھائے دیکھ کر جانے اسے اپنا ماضی یاد آنے لگا۔تمازت اور ملامت کی کتنی لہریں اس کے وجود کو چھوتی گزر گئیں۔اسے یاد آنے لگا کہ کبھی وہ بھی محبت کے صندوق میں بند ایک راز تھی جو چاہتی تھی کہ اسے کھو جا جائے۔تبھی یقین کو کھانے والا جانور نفرت کی زمیں سے نکلا اور اسے دریافت کرکے ختم کردیا۔

وہ شروع سے ایسی نہیں تھی۔ کچھ سالوں پہلے جب وہ کالج میں پڑھتی تھی تب اس کا من بھی لڑکوں کے لیے مچلتا تھا۔وہ چاہتی تھی کہ اس کے بہت سے دوست ہوں جن سے وہ دل کی باتیں کرے اور دوسری لڑکیوں کی طرح ڈھیروں باتیں کرے۔ایسی باتیں کرے جس میں اسے محبت کا انوکھا پن نظر آئے۔محبت کے سنہرے روپ ہر سو بکھرتے محسوس ہوں۔جیسے محبت کی بارش برس رہی ہو اور اس کا وجود محبت کی بارش میں بھیگ کر سکون کا لباس پہن لے۔وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی کسی کی محبت میں مٹ جائے، مر جانے اور جینے مرنے کی قسمیں کھائے۔ محبوب کی خاطر خود کر ہر روز سنوارے۔خود کو نکھارے اور اسی کے روپ میں ڈھل جائے۔

زرینہ کالج کی انتہائی حسین لڑکیوں میں سے ایک تھی۔وہ ایسی تھی کہ سب سے الگ نظر آتی تھی۔وہ روپ نگر کی ملکہ تھی۔وہ کسی پر بھی اپنی شخصیت کا سحر طاری کردیتی تھی۔اس کا وجود مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔وہ کسی کو بھی اپنی طرف کھینچ سکتی تھی۔عجیب سی جاذب نظر لڑکی تھی۔کوئی بھی اسے دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہوسکتا تھا۔جماعت کے طالب علم بھی اس پر جان چھڑکنے کے لیے ہمہ دم تیار رہتے تھے مگر امیر باپ کی بیٹی سے اظہار کرتے ہوئے سب کو شدید ڈر لگتا تھا۔انہی دنوں اسے آریان ملا۔ وجیہہ صورت، لانبا قد، گورا رنگ، اور ہر لمحہ ہنسانے والا لڑکا۔۔۔۔سب سے بڑھ کر وہ کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار نہیں تھا ورنہ کالج کے دیگر لڑکے اچھے گھروں کے ہونے کے باوجود اس کے باپ کی وجہ سے اس سے ڈرتے تھے۔آریان سے باتیں کرتے کرتے

اس لگنے لگا جیسے وہی اس کا مرکز حیات ہے۔اسے لگتا تھا ہر دم ہنسانے والا لڑکا اس کی زندگی میں کبھی غم کو نہیں آنے دے گا۔ ہر لڑکی کی طرح اسے بھی آریان زندگی کی سب سے بڑی حقیقت لگنے لگا۔ وہی ہمیشہ اس کے ذہن میں ہوتا۔ وہی جسم وروح میں خون کے ساتھ گردش کر رہا ہوتا۔ رات کو جب خواب نگر میں جاتی تو اس کا عکس پہن کر جاتی اور جب جاگتی تو اس کے خوابوں میں مخمور نگاہوں کے ساتھ اٹھتی۔

روز دونوں ڈھیروں باتیں کرتے۔

وہ وعدے کرتا۔ زری، میری پیاری زری، تم میرے لیے زر سے قیمتی متاع ہو۔ میں تمھارے لیے چاند بھی زمیں پر لا سکتا ہوں۔

اور وہ اٹھلا کر کہتی۔ نان سینس بھلا چاند بھی زمیں پر آسکا ہے۔ وہ تو خلا کی وسعتوں میں جانے کہاں سورج کی روشنی اوڑھے پھرتا ہے۔ تم نے سائنس میں نہیں پڑھا کیا؟

جب کہ اس کی بات سن کر وہ مسکرا دیتا۔ ہاں میرا چاند زمیں پر ہی موجود ہے۔ مجھے اسے لانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ محبت سائنس سے آگے کی چیز ہے۔

جانے جھوٹی ہوتی یا سچی مگر اس لمحے وہ خود کو وہی رنگ برنگے پروں والی پری سمجھتی جو ستاروں کے ہمراہ کائنات کے مرکز میں محبت کے رنگ برنگے پروں کو اوڑھ کر گھوم رہی ہو۔

وہ آریان کی اس بات پر ایمان لے آئی تھی کہ محبت سائنس سے آگے کی شے ہے اور اسے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ محبت میں محبوب کے ہمراہ کائنات کی کسی بھی وقت سیر کی جا سکتی ہے۔

وہ روز آریان کی محبت میں نکھرتی۔

آریان! تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے نا۔

اس کی بات سن کر وہ مسکرا دیتا۔

بھلا روح بھی جسم سے الگ ہوا ہے۔ تم میری روح ہو زری! جب تعلق دل سے بنے تو پھر وہ روح کے اندر تک سرایت کر جاتا ہے۔

اور وہ اس کی باتیں سن کر کتنی دیر تسلی کے باغ میں ٹہلتی رہتی۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ ایک دن کالج کے باغیچے سے سرخ گلاب توڑ کر آریان نے اس کے بالوں میں سجایا تھا جب کہ وہ خود کو پھولوں کی ملکہ سمجھنے لگی تھی۔

زرینہ تم سرخ پھول جیسی ہو۔تمھارے وجود سے ایک عجیب سے مہک آتی ہے۔ تمھیں دیکھ کر میری آنکھوں کو قرار محسوس ہوتا ہے۔سرخ پھول کو اسی لیے محبت کی نشانی کہا جاتا ہے کیوں کہ اس کی سرخ پتیاں جسم میں دوڑنے والے خون کی رنگت جیسی ہیں۔شاید سرخ گلاب بھی جذبوں کے وجود میں محبت کا سرخ خون بن کر دوڑتا ہو۔

اور وہ دیر تک ہنستی۔دیر تک سرخ گلاب کو ہاتھوں میں لے کر اس میں اپنی محبت کا عکس ڈھونڈتی۔آریان کی محبت کو پھولوں کی مہک میں پرکھتی تو اسے ہر سو محبت مہکتی ہوئی محسوس ہوتی۔اس کا لہجہ جیسے شہد میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا اور وہ سرخ گلاب کو مرجھانے تک اپنے تکیے کے نیچے رکھتی۔

تم رات کو تارے گنتی ہو؟

آریان نے ایک دن اس سے پوچھا تھا تو وہ دیر تک آسمان میں دیکھتی رہی تھی۔

یہاں سے تارے کہاں نظر آتے ہیں۔بس کچھ تارے نظر آتے ہیں۔آلودگی نے ہم سے سب کچھ تو چھین لیا ہے۔

دو تارے سب سے روشن نظر آتے ہوں گے۔

ہاں! وہ بے اختیار جھوٹ بول دیتی۔محبوب کا مان شاید لفظوں میں رکھ لیتی۔

ایک تم ہو اور ایک میں! ہم دونوں اسی طرح محبت کے آفاق پر جلوہ گر رہیں گے۔چمکتے رہیں گے۔

ھاھاھا، جھوٹے۔۔۔۔انسان کہاں آسمانوں میں رہ سکتے ہیں۔پتہ ہے نا سائنس کہتی ہے اوپر صرف خلا ہے اور کائنات۔۔۔۔

تبھی وہ مسکراتا اور کہہ دیتا۔

میں نے کہا تھا نا محبت سائنس سے آگے کی شے ہے۔سائنس سے محبت ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ محبت کی سائنس بھی سمجھ میں آجائے۔

تبھی وہ دیر تک اس کے لفظوں کے دائروں میں گھوما کرتی۔

گلاب چاہتوں میں پھرتی گلاب سی لڑکی آریان کے عشق میں گلابی ہوگئی تھی۔اس کے پورے وجود سے عشق کے گلاب کی مہک آتی تھی۔وہ گلاب کی طرح اس کے عشق میں نکھرتی نظر آتی تھی۔اس کے لفظوں میں آریان گونجتا تھا۔اس کی خاموشی میں وہی چپکے سے دل کے گوشے میں بیٹھ کر خاموش گفتگو کرتا دکھائی دیتا تھا۔

پھر ایک دن وہ چپکے سے اسے چھوڑ کر اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلا گیا۔وہ اسے پکارتی رہی۔اسے پیغامات بھیجتی رہی مگر محبت کو سائنس سے آگے کی شے کہنے والا سائنس کی محبت میں اسے چھوڑ گیا۔پھر ایک دن اس نے اسے فون کر کے بول دیا کہ وہ مزید جھوٹ نہیں بول سکتا۔وہ اس سے محبت نہیں کر رہا تھا بلکہ صرف وقت گزاری کر رہا تھا۔اس نے مشورہ بھی دیا کہ وہ اسے بھول جائے۔

خود غرضی کی بلند چوٹی پر بیٹھے آریان کو اس نے ہمیشہ دل میں جگہ دی تھی۔وہی تھا جس نے محبت کی کونپل کو اس کے دل میں آباد کیا تھا اور وہی تھا جس نے نفرت کی پہلی چنگاری بھی اس کے دل میں روشن کی تھی۔امیر باپ کی بیٹی کا دل ٹوٹا تو خاموشی دروازے کی دہلیز پر باندی بن کر بیٹھ گئی۔وہ چپ ہوگئی۔پھر کلاس کے کسی لڑکے نے چپکے سے اسے بتایا کہ آریان نے کلاس کے لڑکوں سے شرط لگائی تھی کہ وہ امیر باپ کی بیٹی کو اپنی محبت کے دام میں قید کر کے دکھائے گا تو سب لڑکے ہنس دیے تھے اور کہا تھا ایسا نہیں ہوگا۔اس نے زرینہ کو اپنی شرط بنا لیا تھا اور شرط کو پورا کرتے ہی اسے سب سے فالتو چیز سمجھ لیا تھا۔

آریان ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔اسے پیسوں کی کمی نہیں تھی مگر شاید اسے وقت گزارنا تھا اور زرینہ اس کے لیے وقت گزاری کا بہترین مصرف تھی۔اگرچہ وقت گزر گیا مگر آریان نے اسے سمجھا دیا تھا کہ محبت گئے گزرے لوگوں سے کی جائے تو انسان پچھتاوے کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔

جانے کتنے خیال تھے جو اس کے من میں آکر گزر گئے۔اس نے مرجھائے ہوئے پھول کو دیکھا اور لمبی سی آہ کر کے وہاں سے نکل آئی۔وہ وہاں مزید نہیں رک سکتی تھی۔ماضی نے پھر سے اسے بے سکون کر دیا تھا۔آج پھر اس نے خوب رونا تھا اور شاید پچھتاوے کی آگ میں جلنا تھا۔

☆......☆......☆

نیہا اگرچہ ارسلان کے تھوڑا بہت قریب آچکی تھی مگر خود سے لڑتے لڑتے پھر سے دور ہو جاتی تھی۔آج اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ارسلان کو اچھی سی کافی پلائے گی۔

مرد کا پیٹ ہی محبت کا گیٹ ہے

چند سالوں پہلے بھابھی سے یہی الفاظ سنے تھے۔لہذا پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ کافی بیٹ کر رہی تھی۔اگر چہ اس دوران اس کے ہاتھ تھک کر شل ہو گئے تھے مگر ان چاہے جذبے سے متاثر ہو کر وہ پھر سے وہی عمل دہرا رہی تھی۔تھوڑی دیر بعد جب اچھی خاصی کافی تیار ہوئی تو بڑے سے مگ میں ڈال کر ارسلان کے کمرے کی جانب چل پڑی۔اس کا کمرہ سیڑھیاں چڑھ کر کوریڈور میں داہنی جانب تھا۔دروازے پر پہنچ کر نا جانے پھر سے کتنے خدشے سر اٹھانے لگے۔

اگر اسے کافی اچھی نہیں لگی۔

کہیں اسے یہ نہ لگے کہ یہ لڑکی کتنی چیپکو ہے۔

کہیں وہ میرے بارے بدگماں ہی نہ ہو جائے۔

اور اگر کافی اچھی نہ ہوئی اور وہ کہے۔نیہا احمد آپ کو کافی بھی بنانی نہیں آتی تب؟

جانے کتنے سوالات تھے۔کتنے خدشے تھے جن کی وجہ سے اسے ارسلان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے میں دس منٹ سے زائد لگے۔

جی آجایئے۔

دستک پر انتہائی نرم لہجے میں جواب دیا گیا۔

وہ اندر داخل ہوئی تو ارسلان کو سامنے میز پر کسی انگریزی ناول کا مطالعہ کرتے پایا۔

اوہ مس چائے آپ!

ارسلان نے مسکراتے ہوئے مذکورہ القاب سے اسے پکارا تو ایک لمحے اس کا دل کیا کہ کافی وہیں پھینک دے۔

یہ چائے نہیں کافی ہے۔اس نے دل کو مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

یعنی آپ نے ترقی کی ہے یا میں نے۔۔۔۔ جو سفر چائے سے کافی تک پہنچ گیا ہے۔

اس نے ارسلان کی طرف غور سے دیکھا جس کی نگاہوں میں صرف شرارت ہی شرارت نظر آ رہی تھی۔

کون سا سفر! کیا ہم کسی سفر میں ہیں۔

نیہا احمد میں ہمت آ رہی تھی کہ وہ ارسلان سے گفتگو کر سکے۔

ارے مشروب کا سفر! ویسے تو کہا جاتا ہے کہ زندگی بھی ایک سفر ہے مگر یہاں قطعی میری مراد زندگی نہیں ہے۔ کیوں کہ زندگی تو حسین ہوتی ہے جیسے۔۔۔

جیسے؟

جیسے پر وہ اٹک گئی۔

اگر اس نے بدصورت کہہ دیا۔ اگر ارسلان نے کہہ دیا نیہا زندگی بے شک خوب صورت ہوتی ہے مگر آپ ہرگز وہ صورت لے کر پیدا نہیں ہوئیں جو زندگی کو کھلتے پھول جیسی رونق عطا کرتی ہے۔

جیسے کہ میری مما! جیسے کہ اس وقت کپ میں موجود کافی جو آپ نے پکڑی ہوئی ہے۔ سنئے زندگی ایسی ہی حسین ہوتی ہے مگر چائے وہی کام کرتی ہے جو میک اپ کے بعد آپ خواتین کا ہوتا ہے یعنی بدل جاتی ہیں۔

اس کی بے تکان باتیں اسی طرح جاری تھی مگر آج پہلی بار وہ غور سے اسے سن رہی تھی۔

ارسلان آپ سے ایک بات کہوں؟

کتنی ہمت جمع کرتے ہوئے اس نے کہا؟

ارے یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی جو نایاب خاموش پرندہ بھی بولنے لگے گا۔

اس کی بات پر وہ بس مسکرا دی۔

دیکھئے۔ زندگی اتنی بھی حسین نہیں ہوتی جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات۔۔۔

رک جائیں محترمہ! بس رک جائیں۔ یہ ارسلان جان چکا ہے آپ پھر سے غم و اندوہ کی وادی میں لینڈ کرنے والی ہیں اور دکھ بھرے راگ الاپنے والی ہیں۔ مگر میرا موڈ اس وقت رونے کا بالکل نہیں ہو رہا۔

ارسلان نے اسے رستے میں ہی ٹوک دیا تھا۔ اگرچہ اسے کسی کا ٹوکنا سب سے برا لگتا تھا مگر پہلی بار اسے

ارسلان کا ٹوکنا بھی اچھا لگ رہا تھا۔

مگر میں آپ سے حقیقت کہہ رہی تھی۔اس نے دوبارہ بات بناتے ہوئے کہا۔

آپ نے چاند دیکھا ہے؟

وہ اس کے سوال کی منطق نہ سمجھ سکی بس اثبات میں سر ہلا دیا۔

اچھا وہی چاند چودہ تاریخ کو اپنے مکمل جوبن پر ہوتا ہے ایسا ہی ہے نا۔

جی۔

اور اس کے بعد چاند کی جسامت گھٹ جاتی ہے۔یہاں تک کہ ستائیں اٹھائیس کو وہ نظر بھی نہیں آتا۔

جی میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔اسے قطعی سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

اس نے الجھے انداز میں ارسلان کی طرف دیکھا۔

دیکھئے۔زندگی بھی اسی چاند جیسی ہے۔جب زندگی کے آسمان پر خوشیوں کا چاند پورے جسامت سے چمکتا ہے تو ہمیں لگنے لگتا ہے جیسے زندگی یہی ہے۔جب وہی سکھ کا چاند دکھ کی اماوس راتوں کو چھپ جاتا ہے تب ہم کہتے ہیں زندگی دکھ کا نام ہے۔دیکھئے زندگی کسی ایک حالت کا نام نہیں۔یہ کبھی بہت زیادہ خوشیاں دیتی ہے۔کبھی دکھ۔۔۔یہاں کچھ لازم وملزوم نہیں۔تبھی آپ سے کہتا ہوں خود کو بدل ڈالئے۔ہمت پیدا کیجئے۔زندگی ہمیشہ دکھ بھری کہانی نہیں،نا ہی سکھ سے مزین کوئی افسانہ ہے۔

کتنی دیر وہ ارسلان کو دل کی نگاہ میں دیکھتی رہی۔

سکھ کی نگاہ،جس نے اس کے اندر موجود دکھ کے سانپ کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔

کافی اس نے ارسلان کی ٹیبل پر رکھ دی تھی اور وہ چسکیاں بھر کر کافی پی رہا تھا۔

آپ کو کافی کیسی لگی۔یہ سوال پوچھنے کے بعد وہ خود کو حیرت سے تکنے لگی۔

کافی بھی آپ کی طرح معصومیت سے بھرپور ہے۔

ارسلان کی بات سن کر جانے کتنی لمحے وہ اس کے لفظوں میں کھوئی رہی۔

تبھی وہ دوبارہ گویا ہوا۔

بس اس کافی میں ایک خرابی ہے۔

کون سی خرابی؟ ڈرتے دل کے ساتھ اس نے پوچھ لیا۔

یہی کہ جب یہ پہنچی تھی تب نیم گرم تھی شاید آپ کو لگا ہو کہ میں کافی کے غرارے کروں گا۔لیکن یقین کیجئے دنیا میں ایسا کوئی بھی مرض نہیں جس میں نیم گرم کافی سے غرارے کرنے پڑتے ہوں۔آپ کی کافی کسی مرے ہوئے مردے کی طرح ٹھنڈی ہوئی پڑی ہے۔سوچ رہا ہوں۔اسے پیوں یا نمونے کے طور پر الماری میں رکھ لوں۔

اس کی بات سن کر اس نے سر دھن لیا۔وہ کبھی باز آ ہی نہیں سکتا تھا۔اسے بس یہ یاد آ رہا تھا کہ کتنی دیر وہ دروازے کے باہر خود سے لڑتی رہی تھی۔دس پندرہ منٹوں میں کافی واقعی ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔اس باتونی لڑکے کی خاطر وہ خود سے لڑتی رہی۔اس نے ارسلان کی طرف دیکھا جو ہنوز کافی کے مگ کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے ابھی اس میں سے کچھ نکلے گا۔

لائیں میں مائیکرو ویو میں گرم کر کے لاتی ہوں۔اس نے خوش دلی سے کہا۔

کسے کافی کو یا مجھے؟ سنئے کافی کو گرم کرنے کی قطعی ضرورت نہیں اور مجھے آپ گرم نہیں کر پائیں گی کیونکہ کسی طرح بھی آپ مجھے مائیکرو ویو میں گھسانے کی کوشش کریں میں فٹ نہیں ہوں گا۔

اف۔۔۔حد ہے یہ بولتا ہے تو چپ ہی نہیں ہوتا۔

دیکھئے۔چائے سے کافی تک کا سفر میں نے کیا ہے لہذا ٹھنڈے سے گرم کا راستہ بھی مجھے طے کرنے دیجئے۔اس نے نرم لہجے میں کہا مگر ارسلان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

بعض اوقات ٹھنڈی چیزیں گرم چیزوں سے زیادہ لطف دیتی ہیں یا شاید بنانے والے کا کمال ہوتا ہے کہ اس کے ہاتھوں بگڑی ہوئی شے بھی دوسرے کی بنی ہوئی شے سے زیادہ اچھی لگنے لگتی ہے۔

ارسلان کے جملوں پر جیسے وہ سمٹ سی گئی۔

اس کے لفظوں سے قوس وقزح کے کئی رنگ اس کے چہرے پر آ گئے۔

میں سمجھ نہیں پائی آپ کی بات کا مفہوم؟

پہلی دفعہ کھل کر اس نے ارسلان سے لفظوں کی تشریح چاہی۔

دیکھئے نا! میرا مطلب ہے کہ۔۔۔ جانے اس سے لفظ جڑ نہیں رہے تھے یا کیا تھا کہ پہلی دفعہ اس نے سب سے باتونی لڑکے کو لفظوں میں الجھتے دیکھا۔

لائیے میں گرم کر کے لاتی ہوں تب تک آپ سوچ لیں کہ کیا کہنا ہے۔

اس نے مسکراتے ہوئے ارسلان کی ٹیبل سے کافی کا مگ اٹھایا اور گرم کرنے کے لیے چل دی۔

پہلی دفعہ کسی مرد سے اتنی دیر باتیں کی تھیں اور پہلی دفعہ ہی کوئی مرد اتنی دیر اس کی باتوں میں رہا تھا۔ پہلی دفعہ ہی کسی کے لیے مسکرائی تھی اور پہلی دفعہ ہی کسی کو اس نے اپنے لیے لفظوں سے الجھتے دیکھا تھا۔ سب کچھ پہلی دفعہ ہو رہا تھا۔ وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ زندگی ہجری کیلنڈر پر چمکنے والے چاند جیسی ہے۔ ہر تاریخ کو اس کا رویہ اس چاند کی طرح مختلف ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

نسیمہ شکل وصورت کے لحاظ سے کافی خوب صورت لڑکی تھی۔ سپید چہرہ، میٹھی مسکان اور گہری آنکھوں کے ساتھ وہ کسی کو بھی محبت کی منزل کا مسافر بنا سکتی تھی۔ آنکھوں میں لگا سرما اسے مزید حسین بنا دیتا تھا۔

نسیمہ پچیس سال کی عمر میں یہاں آئی تھی۔ اسے یہاں آئے تین ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ انیس سال کی محبت نے تیئس سال میں اسے پوری دنیا میں رسوا کر دیا تھا لہذا پچیس سال کی عمر میں وہ محبتوں اور لفظوں کی حقیقت سے آشنا ہو کر مصنوعی انسانوں سے دور اس بلڈنگ میں آئی تھی۔

نسیمہ تم نے انیس سال کی عمر میں محبت کی۔ تیئس سال میں محبت نے دم توڑ دیا۔ پانچ سال کی محبت نے تمہیں پانچ صدیوں سے بڑھ کر اذیت دی۔ کیا ملا ایسی محبت سے۔۔۔

نسیمہ سے جب اس نے محبت کی حقیقت پوچھی تو وہ ایک دم رو پڑی۔

"محبت بھی ایک دم ہوئی تھی میڈم، رونا بھی اب ایک دم ہی آتا ہے۔ بس محبت تو نہیں رہی یہ جان گئی کہ محبت مرحوم ہو جائے تو انسان زندگی بھر دکھ کے قبر میں زندہ درگور رہتا ہے۔ میری محبت نے اس کے لفظوں کی انگلی پکڑی، تب اس کی محبت بھی اس کے معتبر لفظوں کی طرح پروقار طریقے سے میرے ساتھ چلی۔ وہ مجھے خط بھیجتا تھا۔ اس کے ہر خط میں مجھے زندگی کی مہک محسوس ہوتی تھی۔ میں اسی کے لیے جیتی تھی۔ وہ میرے لیے مرتا تھا۔

منڈیر پر بیٹھے کبوتروں کی طرح میں بھی دل کے منڈیر پر اسی کی آس میں بیٹھی رہتی۔اس کے خطوں کے انتظار میں قریبی دوکان کو روز کھنگالتی۔قریبی ڈاکخانے پر کسی قاصدہ کی طرح روز حاضری دیتی۔جب اس کا خط ملتا کتنے دن اس کے لفظوں کی خوشبو کو اپنے اندر محسوس کرتی۔تب میں کھلکھلا کر ہنستی۔ہر لفظ کو دل سے محسوس کرتی۔ دوسرے شہر سے وہ مجھے اکثر خط لکھتا اور میں کتنے مسائل سے نبرد آزما ہو کر اسے جواب لکھتی۔

جانتی ہیں میڈم! محبت بھلے فریب ہی کیوں نہ دے مگر یہ کمبخت ہوتی ہے۔اس میں بخت کم ہی ساتھ دیتا ہے۔میرے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ایک دن اس کا خط باپ کے ہاتھوں میں پہنچا تو کتنے دن میں کرب اور اذیت کی چوکھٹ پر سرنگوں رہی۔ میرے لیے سارے راستے مسدود کر دیئے گئے۔میرے والد نے مجھے خاندان پر کلنک قرار دیا۔

میڈم جب محبت ہونا تو رستے بھی کھلی فضا کی طرح خود بخود کھل جاتے ہیں۔میں نے اپنی سہیلی کے ذریعے اس سے بات چیت شروع کر دی۔اب خط اس کے پاس آتے تھے اور وہ جواب مجھ سے لکھوا کر اسے بھیجتی تھی۔ محبت یوں ہی کھلتی رہی۔یوں ہی ہمارے دلوں میں جوان ہوتی رہی۔ہم یوں ہی تاویلیوں میں جکڑے محبت کرتے رہے۔

پھر ایک دن سہیلی نے بتایا کہ وہ میرے شہر آ رہا ہے۔اپنے شہر کو ہمیشہ چھوڑ کر، میرے لیے رشتہ لے کر۔۔۔۔جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو گھر کے دروازے سے اندر نہ پہنچ سکا۔مجھے بس اس کی چیخیں سنائی دیں۔سہیلی نے بتایا کہ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔مار اسے پڑی تھی درد کی ٹیسیں میرے وجود سے اٹھ رہی تھیں۔میں نے گھر والوں سے درخواست کی کہ اسے چھوڑ دیں اور مجھے اس کے حوالے سے نکال لیں مگر انہوں نے اسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔تبھی میرے اندر موجود باغی لڑکی باہر نکلی اور جب وہ ٹھیک ہوا تو سہیلی کے ذریعے میں نے ایک رات اپنے گھر کو اپنی ہی نفرت میں جھونک دیا۔میں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔

ہم نے بھاگ کر کورٹ میرج کیا۔ہمیں لگنے لگا تھا کہ ہماری سچی محبت میں شاید شادی بھی سچی ہوئی ہوگی مگر مصنوعی معاشرے میں جیسے شادیاں مصنوعی ہوتی ہیں ویسے کردار بھی مصنوعی ہوتے ہیں۔وہ مجھے محبت کی جنت میں لے گیا تین سال اس نے میرا خرچہ اٹھایا۔چوتھے سال میرے غیرت مند بھائیوں نے معاشرے کے

طعنوں کا قرض ایک رات اسے چند گولیاں مار کرادا کیا۔وہ کسی کام سے انہی کے شہر میں گیا ہوا تھا جب مجھے اس کی موت کی اطلاع ملی۔ وہ دنیا سے اٹھ گیا۔اس کے جانے کے بعد ہر کسی نے مجھے زخمی پرندہ سمجھ لیا۔شاید بھائیوں کو میرا پتہ معلوم نہ ہوا ورنہ وہ مجھے بھی زندگی سے محروم کر دیتے۔میں حالات کا ستم نہیں سہہ سکی۔ماں باپ نے پہلے ہی پیٹ سے نکالنے کے بعد پسند کی شادی پر گھر اور اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔لہذا جب دہیز چادر پہن کر انسانوں کے صحرا میں چلنے لگی تو کوئی انسان نہ ملا۔ہر طرف گدھ تھے۔ہر طرف انسان نما قصائی تھے۔ہر کوئی ہوس کی تیز چھری لے کر مجھے کاٹنے لگا۔

آپ کو ایک بات کہوں۔میں نے انسانوں میں بھی بہت کم انسان دیکھے ہیں۔میرے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا تھا شوہر کی موت کے بعد مجھے اس کے کھانے کے لالے پڑ گئے۔آپ نہیں جانتی مگر ان بھیڑیا نما انسانوں نے، میرے بھوکے بیٹے کے پیٹ کو بھرنے کے لیے بھوکے درندوں کی طرح میرے جسم کو نوچا۔میں نے انصاف کے لیے انصاف کے دروازے کھٹکھٹائے مگر بااثر لوگوں سے کون لڑسکتا تھا۔ چھوٹے سے مکان میں رات کو چھپ کر صاف چہرے والے آتے اور مجھے بھنجھوڑ کر رکھ دیتے۔ایک دن احساس ہوا کہ زندگی میں شاید بدترین کا لفظ میرے وجود سے بڑھ کر کس لیے بنا ہوگا۔تب شریف انسانوں کے جنگل سے بھاگ آئی۔مجھے یہاں تک پہنچنے کے لیے انیس سے چھبیس سال لگے ہیں۔"

میڈم! ان چند سالوں میں، میں نے وحشی انسانوں کا ہر روپ دیکھا ہے۔میں نے ایک عورت کو رات کو انسانوں کے جنگل میں فریاد کرتے اور اس پر ہنستے بھیڑیوں کو دیکھا ہے۔مدد کے لیے پکارتی اکیلی عورت اور خدا کے خوف سے ناآشنا مردوں کو گدھوں کی طرح اپنے اردگرد منڈلاتے دیکھا ہے۔میڈم میں نے انصاف کو گھر کی دہلیز پر مرتے دیکھا ہے۔میں نے زندگی میں بے حس اور شقی ترین انسانوں کو کمزور انسانوں کو رات کے اندھیرے میں غیرت کے دار پر چڑھاتے دیکھا ہے۔میرے نام نہاد بھائی آج بھی میری جان کے درپے ہیں۔انہیں لگتا ہے میں اس معاشرے پر بدنما داغ ہوں۔میرا بیٹا اکثر مجھ سے کہتا ہے۔

"ماما! کیا ہمارا کوئی نہیں"

تب میں اسے آسماں دکھا کر کہتی ہوں کہ وہ جو وہاں ہے ناوہی ہمارا ہے۔

جب وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ کہ بابا کب آئیں گے؟

تب میں اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر تسلی دے کر کہتی ہوں۔

بیٹا بابا اب تمھارے اندر آئیں گے۔ جب تم بڑے ہو گے۔ جب تم باشعور ہو گے بابا تمھارے اندر آئیں گے۔ وہ ہماری دنیا سے باہر اسی لیے گئے ہیں تا کہ تمھاری ذات کے اندر آسکیں۔ میڈم میری محبت کی داستان یہی تک ہے۔

نسیمہ کی کہانی ختم ہو چکی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ زرینہ کافی دیر اسے تسلیاں دیتی رہی۔ اگر چہ اس کی کہانی میں محبت کا کوئی قصور نہیں تھا پھر بھی نا جانے کیوں اس کا دل محبت سے اچاٹ گیا۔

محبت صرف فریب ہے۔ سراب ہے نظروں کا، کسی کے روز کہے گئے لفظوں کا حسین دھوکہ ہے۔ محبت کسی کی زندگی کو موت کی وادی میں لے جانے والی چابی ہے۔ محبت ذات کی بربادی ہے۔ زندگی بھر کسی کو گرم صحرا میں دھکیل دینا ہے۔ محبت کچھ نہیں۔ صرف لفاظی ہے۔ صرف نمائش ہے دل کی، ستائش ہے عورت کی، نمائش ہے خلوص کی، فرمائش ہے کردار کی اور آزمائش ہے زندگی بھر کی۔۔۔۔۔

اس نے دل میں محبت سے کتنی دیر نفرت کی۔

نسیمہ اب تمھیں کیا لگتا ہے حقیقت دنیا کیا ہے۔؟ اس نے نسیمہ کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لیتے پیار سے کہا۔

میڈم، سب سے بڑی حقیقت تو ہم خود ہی ہیں۔ ہم کیسے اپنے آپ کو کسی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کیسے دل و جان کا تصرف کسی کو دے دیتے ہیں۔ جیسے میرے والدین چاہتے تھے کہ میں اپنی ذات کا تصرف انھیں دے دوں۔ وہ کہتے تھے کہ میں ان کی جائیداد ہوں۔ زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ محبت کا دھوکہ لفظوں کی ڈش میں سجا کر کسی کے آگے اہتمام سے رکھ دیا جاتا ہے۔ چپ چاپ خاموش رستوں پر چلتے کسی بھی نا آشنا یا سب سے قریبی انسانوں کے حوالے اپنا پورا وجود کر دیتے ہیں۔ شاید ہم عورتیں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ کسی کو دل دیتے سوچ بھی نہیں پاتیں کہ دل لینے والا اسے کوڑے دان جتنی اہمیت بھی نہیں دے رہا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو بنایا جائے۔ اپنی ذات کی تعمیر کی جائے۔ تعلیم، ہنر اور باقی میدانوں میں خود کو یکتا کیا جائے۔ یہاں آ کر مجھے

احساس ہوا ہے کہ اپنی تعمیر ہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ جب انسان تعمیر ہو جاتا ہے اس کا دل بھی تدبیر کے راستے پر چلتا ہے۔ تب دل ہر جگہ بجھ نہیں جاتا۔ یہی حقیقت ہے۔

وہ مسلسل سوچ میں گم تھی۔ رشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ کیا یہی زندگی ہے۔ کیا یہی احساسات ہیں۔ کیا کسی کو تباہ کرنا ہی زندگی ہے۔ کیا سگے رشتے اتنے بھی بے حس ہو سکتے ہیں کہ اپنی بیٹی کو موت کے گھاٹ اتار سکیں۔ بیٹی کو زندہ درگور کر دیں۔ کیا پسند کی شادی اتنا بڑا جرم ہے کہ جس کی خاطر بیٹیوں کو قتل کر دیا جائے۔ اگر والدین کو لگتا ہے کہ ان کی بیٹیوں کو وہیں شادی کرنی چاہیے جہاں وہ کہتے ہیں تو ان کی تربیت بھی اسی انداز میں کرنی چاہیے۔ ان پر سختی کی بجائے انہیں شعور و آگہی دینا چاہیے۔ اگر نسیمہ کے والدین نے اس کی بات مان کر اس پر شدید تشدد نہ کیا ہوتا تو وہ بھی انتہائی قدم نہ اٹھاتی۔ وہ مسلسل سوچ رہی تھی جب کہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لاجواب انسان کو لاجواب کرنا سب سے مشکل انسان ہوتا ہے۔ اکثر لاجواب انسان کا سب سے بڑا جواب خاموشی ہوتا ہے۔

